"نظریۂ دو قرآن پر ایک نظر"

ایک قرآن

مصنفہ

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب

مہتمم دار العلوم دیوبند

ناشر

ثناء اللہ خاں ۲۶ ریلوے روڈ لاہور

قیمت:۔ دو روپے

★ کتبہ:۔ مختار احمد دبیر۔

★ طابع:۔ انشا پریس لاہور۔

★ ناشر:۔ ایم ثناء اللہ خاں

۲۶ ریلوے روڈ لاہور

فہرست

★

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا ومولینا محمد خاتم الانبیاء والمرسلین وعلیٰ آلہ اصحابہ اجمعین ۰ وعلینا معھم یا ارحم الراحمین ۰

امابعد

حق جل شانہٗ نے اپنی قدرت سے اس عالم کو خیر و شر سے مرکب پیدا فرمایا نور اور ظلمت ۔ سیاہی اور سفیدی حق اور باطل، پاک اور ناپاک بھلا اور بُرا ۔ عاقل اور غبی ۔ جن اور انس ۔ شیطان اور فرشتہ ۔ امیر اور فقیر، بادشاہ اور جاروب کش سب اسی نے پیدا کئے یہ سب حق تعالیٰ کی کائنات اور مخلوقات ہیں ۔

پھر حق جل شانہٗ نے حق اور باطل میں فرق کرنے کے لئے انبیاء کرام کو صحف ہدایت دے کر دنیا میں بھیجا۔ جن میں خیر و شر کے اور حق اور باطل کے متعلق احکام تھے کہ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے اور یہ خیر ہے اور یہ شر ہے حق کا اتباع کرو اور باطل سے پرہیز کرو۔ سب سے اخیر میں قرآن کریم نازل ہوا جس میں حق و باطل اور خیر و شر کا فرق اور حلال و حرام کی تفصیل کی گئی اور جا بجا کائنات ارضی و سماوی میں تدبر و تفکر کا حکم دیا تاکہ اس حق جل شانہٗ کی عظمت و جلال کی معرفت حاصل ہو جس نے ان تمام کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اور پھر معرفت کے بعد اس کے احکام کی تعمیل کریں۔

حکماء اور فلاسفہ نے بھی کائنات ارضی و سماوی میں خوب غور و فکر کیا مگر ان کا مقصد فقط کائنات ارضیہ اور سماویہ کو جاننا اور پہچاننا تھا اور حضرات انبیاء اور ان کے متبعین نے بھی کائنات میں غور و فکر کیا لیکن ان کا مقصد کائنات کی معرفت نہ تھی بلکہ رب کائنات اور خالق ارض و سمٰوات کی معرفت اور پھر اس معرفت سے اس کی اطاعت مقصود تھی قصر شاہی میں مہمان بھی داخل ہوتا ہے اور محل کی چیزوں کو دیکھتا ہے اس کا

کا مقصد بادشاہ کی شان و شکوہ کو دیکھنا ہوتا ہے اور چور بھی شاہی محل میں داخل ہوتا ہے اور جہاں سے کہیں زیادہ ہر چیز کو غور و فکر سے دیکھتا ہے اس کا مطمع نظر محل کا ساز و سامان ہے وہ بادشاہ کو دیکھنا نہیں چاہتا انبیاء کرام اور فلاسفہ کی نظر میں بس یہی فرق ہے۔ کہ انبیاء کرام سموات و ارض میں اللہ کی قدرت اور عظمت کے پہچاننے کے لئے غور و فکر کرتے ہیں۔ اور فلاسفہ اور سائنس دانوں کو خدا سے کوئی واسطہ نہیں ان کا مطمع نظر فقط معدنیات کو جانتا ہے

پروفیسر غلام جیلانی برق نے حال میں دو قرآن کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ جس میں مصنف نے یہ بتلایا ہے کہ ایک قرآن تو یہ ہے کہ جو بشکل مصحف ہمارے سامنے ہے اور ہم اس کی تلاوت کرتے ہیں یہ علمی قرآن ہے اور دوسرا قرآن یہ صحیفۂ کائنات ہے جو عناصر اربعہ اور موالید ثلاثہ کی شکل میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہے یہ عملی قرآن ہے ۔ نباتات اور معدنیات اور فلکیات میں غور و فکر کرنا اور ان کے منافع سے منتفع ہونا قرآن کا اصل موضوع اور اصل مقصود یہی ہے۔

برق صاحب اس مجموعۂ کائنات کو دوسرا قرآن بتاتے ہیں۔ اور یہ نہیں

سمجھنے کہ اس کائنات میں خیر و شر، پاک اور ناپاک، گلاب اور پیشاب۔ گدھا اور کتا اور خنزیر سب ہی کچھ ہے۔ کیا ان کا دل ان کو اس کی اجازت دیتا ہے کہ اس پاک اور ناپاک کے مجموعہ پر قرآن کریم جیسا مقدس اور پاک لفظ اطلاق کیا جائے معاذ اللہ و استغفر اللہ قرآن تو حق جل شانہٗ کے کلمات کا نام ہے۔ صحیفۂ کائنات میں خیر بھی ہے۔ اور شر بھی مگر صحیفۂ آسمانی یعنی قرآن کریم میں سوائے خیر محض کے کچھ نہیں۔ قرآن کریم حق تعالیٰ کے احکام تشریعیہ کے مجموعہ کا نام ہے اور مجموعۂ کائنات کا نام قرآن نہیں۔ برق صاحب یورپ کی زرق و برق سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ ان کو تشریع و تکوین کا فرق سمجھ میں نہ آیا۔ قرآن کریم نے احکام تشریعیہ کے اتباع کا حکم دیا ہے امور تکوینیہ کے اتباع کا حکم نہیں دیا۔ ملائکہ اور شیاطین دونوں بھی اسی کی مخلوق ہیں۔ مگر حکم یہی ہے کہ وحی ملکی کا اتباع کیا جائے وحی شیطانی کا اتباع نہ کیا جاوے۔ اسی نے نمرود اور شداد اور فرعون اور ہامان اور تمام متمدن اور ترقی یافتہ اقوام کو پیدا کیا جن کی مادی ترقیات کے آثار آج کل کے فرعون و ہامان کھود کھود کر نکال رہے ہیں۔ اور لوگوں کو دکھلا رہے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ یہی وہ متمدن قومیں ہیں کہ جو انبیاء کرام کے مقابلہ کی وجہ سے ہلاک اور برباد ہوئیں۔ یہ نشانات درحقیقت انکے ترقی کے نہیں بلکہ اس ہلاکت اور بربادی کے نشانات ہیں۔ جو حضرات انبیاء کے مقابلہ کی وجہ سے

ان پر آئی ۔ برق صاحب کی نگاہ اس زمانہ کے نماردہ اور فراعنہ کے زرق
برق اور مادی ترقیات دیکھ کر اس قدر چکا چوند ہوئی کہ ابراہیم خلیل اللہ اور
موسیٰ کلیم اللہ کی ظاہری بے سروسامانی ان کو حقیر معلوم ہونے لگی اور اس
زمانہ کے نمرود اور فرعون ان کو بلند مرتبہ نظر آنے لگے مگر ان کو
یہ معلوم نہیں کہ حق تعالےٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ متمدن اور ترقی یافتہ
... قوم کے مقابلہ اور اُن کا تختہ الٹنے کے لئے اپنے برگزیدہ بندوں
کو بھیجتا رہا۔ کہ جن کے پاس بیٹھنے کے لئے سوائے بوریے کے اور
اوڑھنے کے لئے سوائے گدڑی اور کمبل کے اور کھانے کے لئے
سوائے سوکھے لقمے کے کچھ نہ تھا فرعون اور ہامان اور تمام قبطی قوم
جنگلوں اور باغوں اور چشموں اور نہروں میں عیش کرتی تھی ۔ اور خدا
کا برگزیدہ بندہ کلیم اللہ ۔ اپنی گلیم (کمبل اور گدڑی) لئے ہوئے خوف
سے چھپا پھرتا تھا۔ علیہ الصلاۃ والسلام

اسی طرح کچھ مدت تک مقابلہ رہا بالآخر حضرات انبیاء کرام باوجود
بے سروسامانی کے غالب اور کامیاب ہوئے اور ان کے دشمن
تباہ اور برباد ہوئے کوئی غرق کیا گیا کوئی زمین میں دھنسایا گیا ۔ کسی پر آسمان

سے پتھر برسائے گئے، کسی کو بندر اور سور بنایا گیا۔

اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ

جملہ قرآن ست در قطع سبب
عز درویش و ہلاک بولہب

اخیر میں حق جل شانہٗ نے نبی مُزَّمِّل اور رسول مُدَّثِّر کملی والے نبی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجا کہ جس کے بدن پر ایک کمبل اور گھر میں ایک بوریا تھا اور دو دو مہینہ تک جس کے گھر میں توا نہ چڑھتا تھا۔ جلانے کے لئے گھر میں چراغ نہ تھا۔ مگر باوجود اس بے سر و سامانی آپ کے غلاموں کے ہاتھ سے قیصر و کسریٰ کا تختہ الٹا دیا۔ اور روئے زمین کے خزانوں کا ان کو مالک بنا دیا

خلاصۂ کلام یہ کہ:۔

انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد ہی روحانیت سے مادیت کو شکست دینا ہے جس کا دنیا ہزار ہا بار مشاہدہ کر چکی ہے اب جس کا جی چاہے حضرات انبیاء کرام کا دامن پکڑ لے اور جس کا جی چاہے عاد ثمود اور

فرعون و نمرود کے طرح ترقی یافتہ اقوام کا کاسہ لیس بنے

مَنْ جَرَّبَ الْمُجَرَّبَ حَلَّتْ بِهِ النَّدَامَةُ

برق صاحب کے اس مضمون یعنی (دو قرآن) کا حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند دامت برکاتہم نے جواب تحریر فرمایا۔ جس کا عنوان (نظریۂ دو قرآن پر ایک نظر) ہے جو روحانیت اور مادیت کے فرق اور دنیاوی ترقیات اور تمدن کی بے ثباتی اور حضرات انبیاء کی فراعنہ اور نماردہ کے مقابلہ میں خارق عادت کامیابی اور کامرانی کے بیان میں بے مثال اور بے نظیر تحریر ہے۔ ع:

(حرف حرفش می دہد جان را رواق)

اس تحریر کے پڑھنے سے حضرات انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد اور آخرت کا منظر اور دنیاوی ترقیات کا بے حقیقت ہونا نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اس وقت یورپ کی مادی ترقیات کی حقیقت وہی ہے کہ جو قوم عاد اور ثمود اور فرعون اور نمرود کی ترقیات کی حقیقت تھی۔ انبیاء کرام کے سامنے سب سراب تھے۔ قاری محمد طیب صاحب کی اس پاکیزہ اور دلپذیر تحریر کو دیکھ کر بارہا دل میں

یہ خیال آیا (اور خدا کرے صحیح ہو) کہ چونکہ یہ تحریر مولّف کے قلم سے فراعنہ اور نمارده کے رد میں - اور حضرات انبیاء کرام کی نصرت اور حمایت میں ایک خاص جذبۂ ایمانی سے نکلی ہے - اس لئے عجب نہیں کہ بوقتِ تحریر حضرات انبیاء کرام کی ارواحِ طیبہ اور نفوسِ قدسیہ کی باطنی اور روحانی توجہات اس پاکیزہ مؤلف کی طرف متوجہ ہوں اور اَللّٰھُمَّ اَیِّدْہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کی تائیدِ غیبی سے مؤلف کا قلم چل رہا ہو۔

حق تعالےٰ شانہٗ مؤلف محترم کو اور ہم غلامانِ انبیاء کو حضرات انبیاء کرام کی معیت اور مرافقت نصیب فرمائے - آمین ثم آمین

اس تحریر دل پذیر کے ظاہری اور معنوی حسن وجمال کو دیکھ کر بے اختیار چند اشعار زبان پر آگئے ؎

شادباش اے خستہ بیمار نظر — کز برایت می رسد کحل البصر

ایں حقائق ایں معارف را ببین — ایں چنیں بیند نگاہِ دوربیں

ریختہ از کلکِ آں روشن ضمیر — کہ ندارد در حقائق او نظیر

طیب بن قاسم است آں ارجمند — ناظمِ دار العلومِ دیوبند

ہست قرآں یک ولیکن احولال — از حَوَل بینند آں را دو قرآں

بہینگاپن ۱۲

ہم چنیں اسلام یک اے خوش سیر　　لیک دو اسلام گوید بد نظر

احولی چوں رفع شد یکساں شوند　　آں دو سہ گویاں یکے گویاں شوند

یہ آخری شعر عارف رومی قدس سرہ السامی کا ہے اور اول کے چھ شعر اس حقیر سراپا تقصیر کی طرف سے ہیں -

اب اس مختصر تحریر کو ختم کرتا ہوں اور اہل اسلام سے استدعا کرتا ہوں کہ اس تحریر کو اول سے آخر تک بار بار پڑھیں انشاء اللہ تعالے باعث ہدایت اور موجب صد بصیرت ہوگی - حق تعالے شانہ اس تحریر دل پذیر کو قبول فرمائیں اور لوگوں کے لئے موجب ہدایت و رشد بنائیں - آمین ثم آمین اور ہم سب کو دین حق پر استقامت نصیب فرمائیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمرۂ خدام میں نا کاروں کا حشر فرمائیں - آمین یا رب العلمین صلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ سیدنا ومولینا محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین ○ وعلینا معھم یا ارحم الراحمین ○

از محمد ادریس کاندہلوی کان اللہ لہ وکان ہو اللہ وجعل ہمتہ وہواہ فیما یحبہ ویرضاہ آمین

۳ صفر الخیر یوم الخمیس ۱۳۷۲ھ جامعہ اشرفیہ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

الحمد للہ وکفیٰ و سلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

امّا بعد۔ محترم پروفیسر غلام جیلانی صاحب برق کا مضمون "دو قرآن" ماہ محرم سنہ ۱۳۷۰ھ میں نظر سے گزرا جبکہ میں کراچی میں مقیم تھا یہ مضمون سنہ ۱۹۴۲ء میں ان کے قلم سے نکل کر رسالہ "البیان" میں قسط وار شائع ہوا۔ اور آج ۴۶۳ صفحہ کی ایک مستقل کتاب کی صورت میں اصحاب نظر کے سامنے ہے مصنف نے "دو قرآن" کے عنوان سے اس قرآن مجید کو جو اوراق میں مرقوم شدہ ہمارے سامنے ہے "علمی قرآن" کہا ہے جو ایک ضابطہ حیات ہے۔ اور اس پوری کائنات کے محسوس صحیفہ کو جو اپنی عظمت شکل میں عناصر اربعہ اور موالید ثلاثہ کو دامن میں لئے ہوئے ہماری آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہے "عملی قرآن" کہا ہے۔ یعنی ایک قرآن خدا کا قول ہے اور ایک قرآن اس کا فعل ہے، مؤلف نے ان دونوں قرآنوں کی آیتوں کو جس میں سے کتاب کی آیتیں تشریعی ہیں اور کائنات کی تکوینی ایک دوسرے پر منطبق کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ جس طرح اس علمی قرآن کا مطالعہ فرض

ہے اسی طرح اس صحیفۂ کائنات یعنی عملی قرآن کا مطالعہ بھی فرض ہے بلکہ پہلے مطالعہ سے بھی زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ

"مطالعۂ کائنات کی اہمیت کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن میں وضو، نماز، صوم و زکوٰۃ۔ حج طلاق قرض وغیرہ پر ڈیڑھ سو آیات ہیں اور مطالعہ کائنات کی سات سو چھپن" (دو قرآن ص۱۱) (حالانکہ انہیں پتہ نہیں کہ صرف ایک نماز ہی کی تاکید سات سو آیتوں میں فرمائی گئی ہے)

پھر ان مقدمات سے یہ نتیجہ نکالتے ہوئے کہ نزول قرآن کا اہم مقصد ہی کائنات فطرۃ کا مطالعہ ہے دعوے کیا گیا ہے کہ ان مادی اور تکوینی امور سے انتفاع اور استفادہ کرنا ہی قرآن کا اصل موضوع اور حقیقی منشاء خداوندی ہے جس کو ترقی کہنا چاہیئے بلکہ یہ استفادہ و انتفاع ہی وہ حقیقی دین ہے جس کو لے کر قرآن نازل ہوا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ

"اگر آج یہ کتاب (قرآن) ہمیں معادنِ ارضیہ و فائنِ جبال اور خزائن بحار سے مستفید ہونے کا درس نہیں دیتی اور ترقی یافتہ اقوام کا ہمدوش نہیں بناتی تو یہ کتاب (خاکم بدہن) صراحتہً ناقص و نامکمل ہے اور اس کا دعویٰ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (میں نے آج تمہارا دین کامل کر دیا) (نعوذ باللہ) بے بنیاد ہے" (دو قرآن ص۱۱)

پھر اس کائنات سے استفادہ کی صورت (جو بزعم برق صاحب منشا خداوندی اور مقصد نزول قرآن ہے) وہ بتائی گئی ہے جو کہ آج کی مادہ پرست مغربی اقوام نے پیش کی ہے یعنی مادیات کی ترکیب و تحلیل اور تجزیہ و تالیف کے ذریعہ ایجادات اور تمدنی ترقیات وغیرہ۔ نہ وہ کہ جس کا نمونہ علمائے اسلام پیش کر رہے ہیں چنانچہ فرمایا

"آج اہل مغرب لوہے، تانبے، بارود، اور دیگر خزائن ارضی سے فائدہ اٹھا کر فلکِ علم و ہنر پر آفتاب بنے ہوئے ہیں۔ ہواؤں میں اڑ رہے، اور دریاؤں میں تیر رہے ہیں۔ زمین کے بعید ترین اطراف کی خبریں لمحوں میں سن رہے ہیں۔ عملِ تبخیر سے ریلیں دوڑا رہے ہیں۔ آنے والے حوادث سماویہ (باد و باراں) کی خبریں دے رہے ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ صحیفۂ کائنات کے مطالعہ کرنے کے بعد اس کے قوانین و آیات کو اپنی بہتری کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف ہمارا مذہبی رہنما یعنی مُلّا احکامِ خدا سے اس قدر جاہل منشا الٰہی سے اس قدر کور اور مطالعۂ کائنات سے اس قدر بیگانہ ہے کہ اسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ ہوا میں چراغ کیوں بجھ جاتا ہے؟ اور آگ کیوں بھڑک اٹھتی ہے؟ دل کیوں دھڑک رہا ہے؟ سانس کی آمد و رفت کیوں ہے؟ دست و پا دل و دماغ حواس و اعصاب

اور عروق و عضلات میں اللہ کے کون کون سے معجزات موجود ہیں۔
رحم مادر میں بچے کی تخلیق کس طرح ہوتی ہے؟ مرور زمانہ کا کرۂ ارض
پر عمل کیا اور کیوں ہے؟ الغرض علمائے اسلام اعمال الٰہی سے یکسر
غافل، معجزات تخلیق سے قطعاً ناآشنا۔ فطرت کے ایمان افروز کارناموں
سے بالکل بیگانہ ہے اور پھر بھی علم کا مدعی ہے"۔ (دو قرآن ص۱۲)
پھر کہا گیا کہ خلافت الٰہی کے معنی بھی اسی مادی ترقی کے ہیں جس کے لئے خدا
نے انسان کو اپنا نائب اور قائم مقام بنا کر اتارا ہے۔ اور یہی اطاعت خدا
وندی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

"زمین پر انسان اللہ کا قائم مقام ہے۔ جس طرح اللہ مادہ کو توڑ پھوڑ
کر تخلیق کے نئے نئے مناظر دکھاتا ہے۔ اسی طرح انسان کو بھی اللہ کی
پیروی کرنا چاہیئے۔ اور لوہے، تانبے اور دوسرے معادن سے
موٹریں، جہاز اور دیگر قوت کے سامان تیار کرنا چاہئیں۔ أَطِيعُوا اللهَ
(تم اللہ کی اطاعت کرو)" (دو قرآن ص۱۲)

پھر "دو قرآن" ص۱۵ پر کہا گیا کہ ایمانداری درحقیقت یہی دنیا داری ہے یعنی
دنیوی اور مادی ترقی ہی وہ علو د عظمت ہے جس کو قرآن نے
أَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ کے عنوان سے ظاہر فرمایا ہے۔ اس لئے حقیقتاً مومن
تو یہی ملحدان مغرب کی اقوام ہیں جو اس مادی جوڑ توڑ میں اس وقت سب سے

آگے ہیں اور کافر و منکر قومیں در حقیقت اس وقت کی وہ مسلم اقوام ہیں جو ان مادی وسائل اور ان کی ترقیات میں فی زمانہ پسماندہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال تالیف زیر نظر کے دعاوی اور مقاصد کا خلاصہ یہ ہے کہ منشاء خداوندی ۔ مقصد نزول قرآن ۔ معنیٔ ایمان ۔ مطلب خلافت اور حقیقی علوم عظمت یہی مادی وسائل کی ترقیات اور یہی کرۂ ارض کے مختلف خطوں کی حکمرانی ہے اور انہیں تکوینیاتی امور کے تکمیل کنندے فی الحقیقت خلفاء الٰہی قرآن کے مطیع اور اللہ کے مومن و ثابت بندے ہیں ۔ ورنہ جو لوگ بھی اس سائنٹیفک ترقیات و ایجادات سے نابلد ہیں وہ علم قرآن سے نابلد فہم قرآن سے عاری اور منشاء الٰہی سے جاہل ہیں ۔

تمہید کی اس اصولی بحث کے بعد مصنف نے اسی اصول کی روشنی میں آئندہ پوری کتاب میں جزئیات کا ذخیرہ پیش کرتے ہوئے مختلف آیاتِ قرآنی سے اس دعوے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کائنات کا یہی استعمالی مطالعہ اور اس کے مواد و عناصر میں یہی ایجادی تصرفات اس کے کھلے اور چھپے خزانوں کی یہی تسخیر اور ان سے نفع اٹھانے اٹھاتے زندگی بسر کر دینا ہی تخلیق انسانی کا مقصد اور قرآن حکیم کا حقیقی منشا ہے ۔ جہاں تک سائنس کے اصول کے مطابق قرآنی آیات کو کائناتی آیات پر ڈھالنے اور تکوینی عجائبات کو قرآن کا موضوع دکھلا کر تشریع کی اس معجز کتاب سے ان کے

استخراج کرنے کا تعلق ہے برق صاحب کی یہ کاوش اور خدمت کوئی نئی اور اچھوتی خدمت نہیں ان سے پہلے علامہ مشرقی (خاکسار لیڈر) اپنی کتاب "تذکرہ" میں اور ان سے پہلے علامہ طنطاوی مصری اپنی تفسیر جواہر القرآن میں اس خدمت کو انجام دے چکے ہیں اور اصحاب نظر اس کا کھرا اور کھوٹا بھی واضح کر چکے ہیں اس لئے برق صاحب کی یہ تالیف زیر نظر ایک مصری اور ایک ہندی کا نقش قدم ہے جسے نقش ثالث کے طور پر انہوں نے پیش کیا ہے۔ تاہم ایک علمی کاوش کی حیثیت سے ان کی یہ محنت بایں معنی قابل لحاظ بھی ہے کہ اس سے علمی سلسلے کے کچھ نئے پہلو ایسے ضرور پیدا ہو گئے جن پر ناقدانہ غور و فکر کرنے سے قرآنی حقائق کے بہت سے مخفی گوشوں کے کھل جانے کا موقع نکل آیا ہے۔ گو خود برق صاحب کے یہ پیش کردہ پہلو منشاء قرآنی اور قواعد شرعیہ کے یکسر خلاف بھی ہیں کیونکہ جس نظریہ اور نصب العین کی روشنی میں یہ جزئیاتی پہلو سامنے لائے گئے ہیں وہ نظریہ خود قرآنی منشا اور موضوع قرآنی کے خلاف جا رہا ہے۔ اس لئے یہ جزئیاتی کاوش بھی قرآنی نقطہ نظر سے مستحسن نہیں ٹھہر سکتی۔

جزئیات کا حسن و قبح کلیات کے تابع ہے

وجہ یہ ہے کہ جزئیات یا فرعیات کسی بھی دائرہ کی ہوں اور کتنی ہی صحیح بھی کیوں نہ ہوں خود بذاتہ ان کا حسن و قبح کوئی معیاری یا معتد بہ چیز نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی خوبی و خرابی کا معیار درحقیقت اُن کا کلیتہ یا اصول ہوتا ہے جس کے سلسلہ سے وہ پیش کی جاتی ہیں۔

مثلاً اگر ایک شخص نماز کے شرعی فضائل بیان کرے مگر خود نماز کو ذکر اللہ اور قرب الہٰی کے بجائے پہلوانی کے نقطۂ نظر سے دیکھ کر ایک جسمانی ورزش کہے تو گو یہ فضائل خود اپنی جگہ کتنے ہی صحیح ہوں مگر اس خاص نقطۂ نظر سے غلط ٹھہر جائیں گے۔ کیونکہ وہ اس نقطۂ نگاہ کے فضائل ہی نہیں۔ اس لئے بات صحیح ہونے کے باوجود اصولاً کذب محض اور خلاف واقعہ ہو جائے گی۔

یا اگر ایک شخص حج کے شرعی محاسن پر تقریر کرے مگر خود حج کو سیاسی نقطۂ نظر سے محض ایک بین الاقوامی کانفرنس تصور کرتا ہو جو تبادلہ افکار یا مظاہرۂ اجتماعیت

کے لئے منعقد کی گئی ہو نہ کہ مظاہرۂ عشق و محبت خداوندی کے لئے تو یہ سارے فضائل اس نقطۂ نظر سے غلط ٹھہر جائیں گے اگرچہ خود یہ فضائل صحیح اور منصوص بھی ہوں۔ کیونکہ سلسلۂ نظر بدل جانے سے وہ بے محل استعمال ہوئے اور وہ کذب محض ہو گئے۔

یا اگر ایک شخص قربانی جیسی عبادۃ کے مناقب تو شرعی بیان کرے مگر خود قربانی کو فدیۂ نفس یا بدلِ جان سمجھنے کے بجائے معاشی نقطۂ نظر سے محض غریبوں کی خبر گیری کا ایک اقتصادی پہلو باور کرتے ہوئے اس کی غرض و غایت صرف اعانت فقراء و مساکین بتلائے اور اس لئے خون بہانے کے بجائے پیسے خرچ دینے کو کافی بلکہ ضروری کہے تو فضائل قربانی پر اس کا یہ سارا بیان غلط ٹھہر جائے گا کہ نقطۂ نظر کے بدل جانے سے یہ فضائل قربانی کے فضائل ہی نہ رہے۔

یا اگر ایک شخص علم کی ضرورت و فضیلت پر قرآنی آیات سے مدلل اور معقول تقریر کرے مگر عمرانی نقطۂ نظر سے یہ علم اس کی نگاہ میں فلسفہ و سائنس یا ہندسہ و ریاضی ہو تو یہ ساری تقریر اس لئے غلط ہو جائے گی کہ منصوص فضائل کی یہ تقریر اس نے خود اپنے زاویۂ نگاہ سے کی نہ کہ قرآنی نقطۂ نظر سے گو فضائل کی آیات و روایات اپنی جگہ بالکل حق اور درست ہوں۔ ۱۳

بہر حال نقطۂ نظر کی تبدیلی سے جزئیاتی مسائل کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ جبکہ جزوی مسائل کی صحت و سقم اور حسن و قبح کا معیار ان کا وہی کلیہ اور اصولی

نقطۂ نگاہ ہوتا ہے جس کے سلسلہ سے یہ جزئیات سامنے لائی جاتی ہیں۔ یہ علمی اور نظری فرق ایسا ہے جیسا کہ عمل کے دائرہ میں شرعی حسنات خبث نیت یا بے محل استعمال ہونے سے سیات بن جاتی ہیں۔ غیبت میں سچ ہی بولا جاتا ہے غلط گوئی نہیں کی جاتی، پس پشت عیب بیانی چونکہ موجب فتنہ و فساد ذات البین اور بے محل ہوتی ہے اس لئے یہ سچ قبیح بن جاتا ہے اور اس سے وہ جھوٹ ہزار درجہ بہتر ثابت ہوتا ہے جو مصلحت ذات البین کے لئے بول دیا جائے پس سچ فی نفسہٖ حسن ہے مگر سلسلۂ استعمال قبیح ہو جانے سے وہ بھی قبیح ہو جاتا ہے پس فضائل ہوں یا احکام اپنے حسن و قبح میں اپنے کلیات و نظریات کے حسن و قبح کے تابع ہوں گے کسی سلسلہ میں آکر خود ان کا ذاتی حسن و قبح معتبر نہ ہوگا کہ صرف اسے ہی اثبات مدعا کی کافی دلیل سمجھ لیا جائے۔

ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ جزئیات جمع کر کے نقطۂ نظر بنانا یا کلیہ اور اصول قائم کرنا فہم اور ذوق کے تابع ہے اس لئے نظریہ کی خوبی و خرابی درحقیقت ذوق و وجدان کے صحت و سقم کے تابع ہے۔ اگر مذاق ہی سلیم یا شرعی نہ ہو اور وہ ذہنیت ہی مستقیم نہ ہو جس سے نظریات ابھرتے ہیں بلکہ شرعی حیثیت سے زیغ اور کجی لئے ہوئے ہو تو ظاہر ہے کہ نظریات اور استنباط کردہ اصول بھی اسی زیغ اور کجی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے نکلیں گے اور اس لئے اس

سے پیدا شدہ یا حاکم کہ وہ تمام جزئیات و فرعیات اس ایک ہی جامع فیصلہ سے غلط ٹھہر جائیں گی کہ ان کا کلیہ اور نظریہ اور نظریات ہیں سمایا ہوا ذوق غلط اور ٹیڑھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس نقطۂ نظر بنانے والی قوۃ یعنی ذوق اور ذہنیت کی اصلاح و تقویم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اور اسی اصلاحِ عمل کا نام تزکیہ رکھ کر اسے نبوۃ کے فرائض چارگانہ میں سے ایک اساسی اور بنیادی فریضہ قرار دیا ہے۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے بنار کعبہ کے وقت اپنی ذریت کی دینی و دنیوی صلاح و فلاح کے لئے ایک عظیم الشان رسول مبعوث کئے جانے کی دعار مانگتے ہوئے یہی چار باتیں۔ تلاوۃ آیات، تعلیم کتاب، تلقین حکمۃ، اور تزکیہ نفوس بطور فرائض رسالت اللہ سے مانگی تھیں جن میں سے آخری بات جو اوّل کی تین باتوں کے لئے اساس و بنیاد ہے یہی تزکیہ ظاہر فرمایا تھا کہ اس کے بغیر دل کا وہ ذوق ہی درست نہیں ہو سکتا جو نقطۂ نظر اور نظریات کے صحیح ہونے کا معیار ہے۔ پس اس تزکیہ کا حاصل اصلاحِ قلب اور اصلاحِ قلب کے واسطہ سے اصلاحِ اخلاق اور اصلاح اخلاق کے واسطہ سے اصلاح ذوق و ذہنیت ہے تاکہ ذہن انسانی درست ہو کر فہم سلیم، ذوق صحیح اور دل و دماغ کا نقطۂ نگاہ سیدھا ہو جائے اور انسان ہر مسئلہ کو اسی کے رنگ میں دیکھنے کا اہل ہو جائے نہ کہ اپنے نفسانی رنگ میں دیکھنے کا جو اس پر ماحول یا عوارض وغیرہ کے سبب چڑھا ہوا

ہو۔ پس نہ تو مفکر کا نقطۂ نگاہ پھرا ہوا ہو کہ دیکھ ہی نہ سکے نہ بھینگا ہو کہ ایک کے دو دیکھنے لگے۔ اور نہ ناقص ہو کہ دو کو ایک دیکھنے کا خوگر ہو جائے۔ بلکہ جو کچھ ہو جتنا ہو اور جیسا ہو وہی بعینہٖ دیکھے اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْاَشْیَاءَ کَمَا ھِیَ عہ حاصل یہ کہ محض اس کا ارادہ اور نیت ہی مسلمان نہ ہو بلکہ وجدان بھی مسلمان بن جائے کہ جو کچھ بھی وہ کتاب و سنت سے سمجھے اور دیکھے صرف مسلمانہ ذوق سے سمجھے اور دیکھے نہ کہ منکرانہ اور ملحدانہ ذہنیت سے۔ ورنہ انہی قرآنی آیات کو مثلاً مشرکانہ ذوق و ذہنیت سے سمجھا جانے لگے تو ان کا رنگ اور ہوگا۔ نصرانی ذوق سے دیکھا جائے تو رنگ دوسرا ہوگا۔ یہودی رنگ سے پرکھا جائے تو رنگ کچھ اور ہوگا۔ آیات قرآنی ہر صورت میں وہی رہیں گی مگر ان کے مضامین اور مقاصد کی نوعیت کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔ اور ہر رنگ میں عوام کو آیات قرآنی کا نام لے کر مبتلائے فریب رکھا جا سکے گا۔

پھر اسی طرح مسلم نما جماعتوں کے مکاتیب خیال اور نقاط نظر جدا جدا ہیں جو اسی ذوق و وجدان کے تفاوت سے متفاوت اور بدلے ہوئے ہیں۔ معتزلہ کا رنگ فہم اور ہے اور قدریہ کا اور۔ خوارج کا ذوق و فہم اور ہے اور روافض کا اور۔ اس لئے بہ مقدار زیغ و استقامت اُن کے ذوق و وجدان کا صحت و سقم بھی متفاوت ہے۔ ان وجدانوں سے نکلے ہوئے افکار و نظریات

عہ اے اللہ تمام اشیا ہم کو اپنی اصلی صورت میں دکھا ۱۲

بھی متفاوت ہیں۔ اور ان نظریات کے ماتحت آیات و روایات کے اخذ کردہ
معانی و مطالب بھی متفاوت ہیں جن میں زمین و آسمان سے بھی زیادہ فرق و
تفاوت ہے۔ مگر قرآن کا نام ہر جگہ یکساں ہے اور اسی کی امامت کے نام پر
لوگوں کو ان نظریات و حکمیات کی طرف بلایا جاتا ہے اب ظاہر ہے کہ ان میں
سے جس کے نظریات کو بھی غلط کہا جائے گا۔ اور جو بھی کہنے گا وہ آیات قرآنیہ
کی تغلیط نہیں کرے گا بلکہ اس طبقہ اور فرقہ کے مفہوم پر حکم لگائے گا اور یہی حکم
انجام کار اس طبقہ کے ذوق اور وجدان پر ہوگا نہ کہ آیات پر۔ پس اس کے ذوق
کے غلط ہونے کی وجہ سے نظریات کو غلط اور ان نظریات سے استخراج کردہ
مسائل کو غلط کہا جائے گا نہ کہ آیات و روایات کو۔ اس لئے کسی کے پیش کردہ
نظریات پر غور و فکر کرنے کے سلسلہ میں اس کے ذوق و وجدان اور
ذہنیت سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی۔

اور یہ ظاہر ہے کہ ذوق و وجدان کی تربیت کا طریقہ سوائے اربابِ ذوق و
وجدان کی معیت اور کثرۃ ملازمت کے دوسرا نہیں ہو سکتا جس کے لئے
استناد خلف اور شہادۃ سلف ہی سب سے بڑی حجت اور علامت سمجھی
گئی ہے۔ اسی لئے ہر عالم کے علم پر حکم لگانے کے لئے اس کا سلسلہ سند
اور اس کے اساتذہ کے دین و علم کی نوعیت معلوم کی جاتی ہے اور یہ سلسلہ
سند ہی اس عالم کے علم کی صحت و سقم کی سب سے بڑی شہادت ہوتی ہے۔

صحابہ رضؓ کے صحت ذوق کا ضامن صحبت نبوی اور ذات بابرکات سے انصباغ اور آپ کے ساتھ اسناد ہے جس نے مشرکانہ ذوق نکال کر ان میں موحدانہ ذوق و معرفت کو پیدا کیا۔ ان کے قلوب کا راستہ سیدھا کیا جس سے ان کا نقطۂ نگاہ ہر کجی اور زیغ سے پاک ہو کر خالص استقامت کی راہ پر آگیا۔ اور وہ ہر مسئلۂ قرآنی و حدیثی کو باوّلِ دخلہ اسی کے رنگ میں سمجھنے کے اہل اور عادی ہو گئے۔
تابعین کے لئے صحابہ سے استناد و انصباغ اور ان کی صحبت و معیت منشاء تربیت ذوق ثابت ہوئی۔ تبع تابعین کیلئے تابعین سے استناد و ملازمت اور صحبت یافتگی اساس استقامت ثابت ہوئی۔ حتیٰ کہ اسی طرح بعد کے قرون میں آج کے دور تک استقامت ذوق کے لئے بھی اہلِ ذوق و وجدان کی سند، معیت، ملازمت اور صحبت یافتگی ہی سلامتئ ذہن و ذوق کی بنیاد ثابت ہوتی رہی ہے۔ جس سے رنگ پکڑنا اور منصبغ ہو جانا ہی صحتِ ذوق کا ضامن رہا ہے۔ جیسا کہ اس کے بالمقابل اربابِ فتنہ میں اس سند و شہادت سے گریز، اہل اللہ کے اقوال و مذاق کی پیروی سے پہلو تہی۔ اہلِ دل کی معیت و ملازمت سے انقطاع۔ اہلِ حال کے احوال صادقہ سے رنگ نہ پکڑنا۔ اپنے ذاتی فہم و عقل پر غرور و گھمنڈ کرتے ہوئے سابقین کے فہم کو اپنے فہم کے لئے کسوٹی نہ سمجھنا یا بالفاظ دیگر ان کے فہم سے اپنا فہم نہ بنانا ہی اساس فہم سمجھا گیا ہے اور فہم کی جگہ غرورِ فہم پر قناعت کر لی گئی ہے۔ اس لئے مسائل فہمی میں ان کا ذہن و

ذوق امام رہا کیا ہے جو تربیت سے عاری رنگ انقیاد سے خالی اور صبغۃ اللہ سے کورا رہتا آیا ہے۔ اور جس میں روحانی معرفت کے بجائے جبلی اور نفسیاتی خیالات گردوپیش کے حالات اور وقت وقت کے محرکات سے ذہنی مرعوبیت کے جذبات بھرے ہوئے رہ جاتے ہیں جو اس ناتربیت یافتہ ذہن کی پیداوار اور نفس کے اختراعات ہوتے ہیں مگر غرور فہم سے ان کو مدلولات قرآن و حدیث سمجھ لیا جاتا ہے تاآنکہ انہی ناہموار جذبات سے نظریات اور نقاط نظر ابھرنے لگتے ہیں جن سے جزئیات فہمی کا سلسلہ چل پڑتا ہے اس لئے وہ جزئیات خواہ قرآنی ہی کیوں نہ ہوں مگر ان غلط رو جذبات و افکار کے سلسلہ کے سامنے آکر اس لئے قابلِ قبول نہیں رہتیں کہ اُن کے وہ مخترعہ اصول قابلِ رد ہوتے ہیں جو زیغ آمیز فہم و ذوق سے اخذ کئے جاتے ہیں پس بحث و نظر اور نقد و تبصرہ کے وقت اصل میں یہ بدذوق نظریات رد کئے جاتے ہیں نہ کہ قرآنی جزئیات گو بظاہر رد و قبول کا عمل ان پر بھی جاری نظر آتا ہے اس لئے استدلال میں قابلِ توجہ وہ جزئیات نہ ہوں گی جو پیش کی گئی ہوں بلکہ وہ اصول و نظریہ اور اس سے آگے وہ وہ ذوق ہو گا جس کے سلسلہ سے یہ جزئیات سامنے لائی گئی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ کے سامنے توحید رکھی حالانکہ وہ نفسِ توحید کے منکر نہ تھے نبوت پیش کی حالانکہ وہ نبوت کو بھی مانتے تھے مبدا و معاد پیش کیا حالانکہ وہ اس کے

بھی قائل تھے مگر پھر بھی انہیں منکر و کافر کہا گیا اور ان ہی عقائد کی دعوت دی گئی جن کے وہ کلیتہً منکر نہ تھے محض اس لئے کہ وہ ان مسائل کو مشرکانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کے خوگر تھے اور حضورؐ انہیں مؤمنانہ اور مسلمانہ ذہنیت سے سمجھانا چاہتے تھے ۔ بالفاظ دیگر انہیں صرف مسائل ہی سمجھانا نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کی ذہنیت اور ذوق و وجدان کو بھی تبدیل فرمانا چاہتے تھے جس سے حقائق کا صحیح مفہوم ان کے ذہنوں میں اترا کرے اور محض ان کے ہاتھ پاؤں اور زبان ہی مسلم نہوں بلکہ ان کا دل و دماغ اور ذہن و وجدان بھی مسلم ہوجائے مگر جب کہ انہوں نے اس سلسلہ ہی کو قبول نہ کیا جس کی یہ جزئیات تھیں اور اس ذوق ہی کو نہ اپنایا جس سے یہ سلسلہ چلنا تھا تو وہ مسلم بھی نہ کہلائے گو فی الجملہ وہ ان تمام مسائل کے قائل تھے۔

مجھے معاف کیا جائے اگر میں یہ عرض کروں کہ برق صاحب نے اس "علمی قرآن" اور "کائناتی قرآن" کی باہمی تطبیق دکھاتے ہوئے جن مسائل کی طرف رہنمائی کی ہے ان میں کل یا بعض خواہ فی نفسہ صحیح بھی ہوں مگر اس لئے قابلِ تسلیم نہیں کہ ان مسائل کو جس سلسلہ سے پیش کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں جس نقطۂ نظر کا ثبوت دیا گیا ہے اور اس نقطۂ نظر میں جس ذوق و ذہن سے کام لے کر ان مسائل کا تجزیہ کیا گیا ہے وہ ذہن بظاہر نا تربیت یافتہ اور خود اپنے ہی اختراعات کے دھوکہ میں آیا ہوا ہے کیونکہ انہوں نے قرآن کو اس کی حقیقی تشریحات سے الگ

کرکے محض زور مطالعہ اور محض اپنے ہی ذہنی رُخ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے
بلحاظ نقطۂ نظر انہوں نے قرآن کو تقویٰ و طہارت، اخلاق و روحانیت، زہد و
عبادت، خشوع و انابت، اتباع سنت و اقتضائے آثار سلف اور خلافت
الٰہی کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کے بجائے عصری بنیادوں فلسفہ و سائنس،
معاشیات و اقتصادیات، عمرانیات و سیاسیات، تعیش و تفریح اور رسمی جاہ
و اقتدار یعنی ملوکیت و سلطنت، موجودہ دنیا کے خالص مادی افکار و نظریات
کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا تو انہیں ہر آیت میں سے خالص مادیت کا ایک
سیلاب امنڈتا ہوا نظر آیا۔ اور آج کی متمدن اور بر عکس نام نہاد مہذب اقوام
کی عنصریاتی ترقی ہی ان کی مرعوب نگاہ میں قرآنی ترقی اور اس کا نصب العین
دکھائی دینے لگی۔ حتیٰ کہ یہ مادی کھود کرید اور اس کے موالید دخان و بخار،
گیس و برق، ریل و تار، طیارہ و سیارہ اور فون و لاسلکی وغیرہ پھر ان وسائل
نقل و حمل اور اسباب علم و خبر کے وسیلہ سے ایک طرف اسباب زینت و
تعیش کی توسیع سے دنیا میں ہولناکی، عیاشی، حرص و آز، بد اخلاقی و سیاہ کاری
اور صد انواع فسق و فجور کی وسعت و کثرت اور دوسری طرف اسباب
تباہی و ہلاکت اور مہلک آلات حرب و ضرب گن اور بم ایٹم اور گیس بارود
اور تیزاب وغیرہ کی تیاری سے استبدادی طور پر اقوام عالم پر زور آزمائی،
غلام سازی، قتل و غارت گری، علانیہ جور و جفا اور عالمی امن و سکون کی بربادی

کی جہتات اور پھر یہ سب کچھ بنام امن و صلاح یعنی کھلی عیاری، مکاری، ڈپلومیسی، نفاق اور باہمی بے اعتمادی کی وسعت و ہمہ گیری، خلاصہ یہ کہ اس مکر و فریب کی راہ سے ان غیر معتدل اور حد و در رفتہ عیاشیوں اور حد سے گزری ہوئی تباہ کاریوں کے پردہ میں بہیمیت کا غلبہ، درندگی کا زور، اور شیطنت کا استیلا رہی (جو ان اسباب تعیش و ہلاکت کی افراط کا قدرتی نتیجہ ہے) برق صاحب کے نزدیک نبوت و خلافت کی اصلی غرض و غایت ٹھہر گیا۔ اور اس دنیاداری ہی کو انہوں نے ایمانداری قرار دیدیا۔ حالانکہ اس کے مٹانے کے لئے تو انبیاء کی نبوت اور خدا کی خلافت دنیا میں آئی تھی۔ پس انہوں نے اپنی برق رفتاری سے نبوت و خلافت کی غرض و غایت ہی کو الٹ دیا۔ اور قلب موضوع کے اس الٹ پھیر میں آکر ایک نکھرتے ہوئے روحانی اور اخلاقی نصب العین کو خالص مادی نصب العین بنا دیا۔

لیکن اس مادی نقطۂ نگاہ کا نہایت ہی مہلک اور خطرناک نتیجہ ایک تو یہ نکلتا ہے کہ اسلام کا قرن اوّل اور صحابۂ مقبولین کا طبقہ معاذ اللہ سب سے زیادہ ضعیف الایمان قلیل العلم اور محروم العمل قرار پاجاتا ہے۔ جس نے منشاء قرآنی کے مطابق نہ ایک مشین بنائی نہ ایک انجن ہی ایجاد کیا نہ دخان و بخار سے کلیں چلائیں نہ خوبصورت چھری کانٹے ڈھالے نہ کریم اور پاوڈر تیار کئے نہ چہروں کو گلگوں بنانے کے لئے غازے اور لیونس بنائے۔ نہ آرائشی سامانوں کی تخلیق کی۔

نہ ہواؤں میں اڑتے پھرے۔ نہ پانیوں میں بہتے ہوئے دکھائی دیئے نہ کسی
نے مہلک آلات ایجاد کر کے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کا منٹوں میں
صفایا بولا۔ نہ استعماری اغراض کے ماتحت دنیا میں جبر و استبداد اور ظلم و
ستم پھیلایا نہ سائنٹیفک آلات کی طاقت کے بل بوتہ پر قوموں کی غلام سازی
کی نہ اپنی استعماری اغراض کی خاطر زیر دستوں کے تڑپتے ہوئے جذبات کے
ساتھ کھیلنے کی کوشش کی۔ اور نہ ہی دنیا کا سرمایہ کھسوٹ کر آلات لہو و
لعب، باجے گاجے، سینما تھیٹر، فواحش و منکرات کے مناظر، بے حیائی
اور بے حجابی کے عریاں نقشے دنیا میں رائج کر کے اپنی تجارت کو فروغ دیا۔
غرض برقی صاحب کے تجویز فرمودہ منشا قرآنی کے مطابق نہ مشینی تمدن
برپا کیا نہ بجلی سے بلڈنگیں جگمگائیں نہ ڈامر کی سڑکوں پر موٹریں دوڑائیں۔
اور نہ خود ہی ان تفریحات و تعیشات کی لائنوں پر دوڑے۔ اس لئے اسلامی
اور قرآنی حیثیت سے قرن اول کی زندگی معاذ اللہ سب سے زیادہ ناکام اور
اسلام سے بعید زندگی رہی۔

ادھر اس کے برعکس جوں جوں قرن نبوت سے بعد ہوتا گیا اسی قدر
یہ سائنٹیفک ترقیات بڑھتی گئیں۔ گویا علم قرآنی ترقی کرتا گیا۔ فہم انسان
تیز ہوتا گیا اور عمل بالقرآن کا ذوق بڑھتا گیا گویا نبوت کے قرن سے بعید
ہونا ہی امت کے حق میں رحمت ثابت ہوا۔ کہ سمجھ اور فہم صحیح ہو گئے اور

لوگ ایمانداری کا صحیح صحیح مفہوم سمجھنے کے لائق ہو گئے۔ مگر قرن نبوت کی موجودگی میں امت کو فہم و علم اور عمل کے لحاظ سے حرمان و خسران کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ پس برق صاحب کے ان دعوی کردہ مقدمات کا خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ قرن اول بلحاظ علم و عمل معاذ اللہ شر القرون ثابت ہو گیا اور یہ آج کا شر القرون خیر القرون بن گیا۔ حالانکہ لسانِ پیغمبر پر خدائی دعوی یہ تھا۔

خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ	زمانوں میں سب سے بہتر میرا زمانہ ہے۔
ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ	پھر وہ لوگ جو خیر القرون والوں سے
ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ	متصل ہوں اور پھر جو ان لوگوں سے متصل ہوں۔

پس کلام نبوی میں تو عہد نبوت کا خیر و برکت اور اس کی وسعت و کثرت کی طرف اور زمانہ مابعد میں رفتہ رفتہ اس خیر و برکت کا قلت اور ضعف کی طرف بڑھتے رہنا بتلایا گیا ہے۔ مگر کلام برق سے قصہ برعکس ثابت ہو رہا ہے۔ ادھر کلام نبوی سے تو نبوت عالم کے لئے رحمت ثابت ہو رہی ہے اور کلام برق سے زحمت ثابت ہوئی۔ قرآن نے تو ایمانداری کا مفہوم علم نافع کے ساتھ حسن اخلاق اور فضائل اعمال قرار دیا تھا جس کا سرچشمہ نبی کی روحانیت ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر اس ایمانداری کی ترقی کا اعلیٰ ترین وقت تو زمانہ نبوت اور اس سے قریب عہد اور اس کے تنزل کا وقت نبوت اور اس سے ملحقہ زمانوں سے بُعد عہد ہی میں ہو سکتا ہے مگر کلام برق میں ایمانداری کا مفہوم

دنیا داری یعنی تمدنی ترقیات اور سائنٹیفک ایجادات ہیں جن کا سرچشمہ عقل معاش
اور خالص مادیت ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر ان کی مزعومہ ترقی تو نبوت سے
بعد عہد میں اور اس ترقی کی پستی یا اس کا وسیلہ محض رہ کر سربلند نہ ہو سکنا نبوت
اور اس کے قریبی زمانوں ہی میں ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک اُمتی کے کلام کو نبی
کے کلام سے یہ بُعد اور نتیجۂ کلام میں نبوت سے یہ صریح معارضہ، نتیجہ ہے ذہن
اور نقطۂ نظر کے تاتربیت یافتہ رہ جانے اور ذوق کو زیغ آمیز چھوڑے رکھنے
کا نہیں بلکہ برقی صاحب کے اس اصول پر سارے ہی انبیاء علیہم السلام پر حرف
آجاتا ہے۔ کیونکہ ان کے دور میں مادی اور تمدنی ترقیات تو کیا ترمیں برپا
شدہ ترقیات بھی موت کے گھاٹ اتار دی گئیں۔ انہوں نے اپنے اپنے دور
خیر و برکت میں تمدنی تعیّشات اور عیش دنیا کے گھڑے ہوئے تکلف آمیز
نقشے اپنی پوری روحانی قوت سے مٹائے ہیں جن کو قائم کرنے میں مادی
مزاج اور فلسفی طبع لوگوں نے انتہائی کاوشِ دماغ اور مستعدی دکھائی تھی۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کلدانیوں کی تمدنی ترقیات پر پانی پھیر دیا
تھا۔ جو بعض حیثیات سے آج کی تمدنی ترقیات سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ
کر تھیں۔ اور لوگوں کو پھر سے اسی سادہ تمدن کی دعوت دی جس میں تکلفات
اور افراطِ عیش کا وجود نہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون
اور فرعونیوں کا وہ ملکی اور شہری کروفر ختم کر کے چھوڑا جس پر

فرعون اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَھٰذِہِ الْاَنْھٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ[علی] دیکھ کر فخر کیا کرتا تھا اور انہیں اسی بے تکلف سادہ تمدن پر لانے کی کوشش فرمائی۔

بنی اسرائیل جب بھی اس تمدن کی تکلف آمیز رنگ رلیوں میں پڑے اور طبعی نتیجہ کے طور پر فساد فی الارض میں مبتلا ہوئے۔ جب ہی ان پر عذاب خداوندی مسلط ہوا۔ اور دوسری جابر قومیں بخت نصر، طیطس رومی وغیرہ ان پر مسلط ہو گئے۔ اور بنی اسرائیل کو محکوم اور غلام بننے کے سوا چارہ کار باقی نہ رہا اور بالآخر جب بھی متنبہ ہو کر انہوں نے اس تمدنی تکلفات اور ان کے خواص و آثار یعنی سرکشی اور طغیان کو خیر باد کہہ دیا۔ اور اسی سادہ اخلاقی تمدن پر آئے جو ہمیشہ انبیاء کا تمدن رہا ہے۔ تب ہی وہ پنپے اور از سر نو ان کا گیا ہوا وقار و اقتدار بازیافت ہوا۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کے دو عظیم الشان مادی تمدنوں یعنی رومی اور ایرانی کو ودفر اور عمرانی عجائبات کو مٹا دینے کا پروانہ ڈالا۔ اور ان کے مٹ جانے کی پیش گوئیاں فرمائیں جن کے مطابق آپ کے پاکباز صحابہؓ نے عین منشاء نبوی کے مطابق اپنی فتوحات سے ان تکلف آمیز تمدنوں اور ان کی سرپرست حکومتوں کو درہم برہم کر ڈالا اور وہی سادہ تمدن قائم کر دیا۔ جو مقاصد عبودیت میں حارج نہ ہو۔ کسریٰ کے ٹھاٹ باٹ کے بے نظیر سامانوں

علی یعنی کیا میں ملک مصر کا بادشاہ نہیں ہوں؟ اور یہ نہریں میرے محلات کے نیچے سے نہیں بہہ رہی ہیں؟

مافوق العادة سیم و زر کے ظروف و تاج اور اعلیٰ اعلیٰ نمونوں کے اموال قالینوں وغیرہ جب کہ وہ بسلسلۂ مال غنیمت مسجدِ نبوی میں لائے گئے۔ فاروق اعظمؓ رو پڑے اور فرمایا کہ یہی وہ سامانِ تعیش ہے جس کی بدولت فارسی قوم آج مسلمانوں کی محکوم اور مفتوح ہے۔ ڈر ہے کہ یہ سامان کہیں ہمیں بھی مبتلائے تعیش کر کے کسی قوم کے ہاتھ پر مفتوح اور غلام نہ بنا دے۔ ظاہر ہے کہ فاروق اعظم کو یہ ڈر ملائیت کی سادگی سے نہ تھا بلکہ اسی معاونِ ارضیہ و خزائن جبال اور خزائن بحار کے رنگین سامانِ تمدن سے تھا، جس کے سائنٹیفک نمونے اس وقت قیصر و کسریٰ نے دنیا کو دکھائے تھے۔ اور آج دانایانِ فرنگ پیش کر رہے ہیں۔

خلفائے راشدین یا ملوک عادل کے زمانوں میں تمدن سادہ اور اخلاقی رہا۔ سامانِ عیش و نشاط کم سے کم اور سامانِ ہلاک و تباہی تقریباً مفقود رہا۔ اس لئے اسلامی فتوحات اور دائرۂ خلافت کی وسعت و قوت بھی اسی دور کا طرۂ امتیاز ہے۔ جوں جوں عجمیت اور بالفاظِ دیگر قیصریت اور کسرویت اور بالفاظِ واضح مادیت اور اس کی تعیش آفریں صورتیں پیدا ہوتی رہیں ووں ووں اخلاقی ترقیات کے قدم سست پڑتے گئے اور ہجوم و اقدام کے بجائے کھانے یا ٹھٹھے پر خانہ جنگیاں بڑھتی گئیں اور مسلمان اولاً من حیث المذہب اور پھر من حیث القوم رو بہ انحطاط ہوتے گئے۔ پانسو برس بعد اس تعیش اور تمدنی تکلف نے عربوں کی دولت ختم کر دی جو پھر لوٹ کر نہیں آئی اور دوسرے پانچسو برس کے بعد تدریج ترکوں کی دولت

سمیٹ دی جو پھر اپنی اصلی حالت پر نہیں لوٹی اور بالآخر تیسرے پانچ سو کے آغاز میں یہ اسلامی قوم نصرانی اقوام کی سنگینوں کے نیچے آگئی شروع ہوگئی۔ جس سے آج تک بھی اُسے چھٹکارا نصیب نہیں ہوا ہے گویا عربوں اور ترکوں نے جن قوموں سے سائنٹیفک ترقیات اور تمدنی تکلفات کا ورثہ پایا تھا بالآخر انہی کی غلامی اور محکومی بھی ورثہ میں پائی اور اب جن اقوام نے عربوں اور ترکوں سے رسمی اور نمائشی تمدن و ترقی کا ورثہ حاصل کیا تھا وہ بھی آخرکار ان ہی کے انجام کی طرف بڑھتی آرہی ہیں۔ کسی کی چودھراہٹ ختم ہوئی کسی کا ملک گیا۔ کسی کے اقتصادیات گئے اور کوئی خود سے گئی۔ غرض یہ مقدمات ہیں۔ سب کچھ چلے جانے کے، حاصل یہ ہے کہ اقوام کا حدوث و بقا ربالآخر اسی سادہ معاشرت اور بے تکلف تمدن میں نکلتا ہے جو ان سائنٹیفک ترقیات و تعیشات اور نام نہاد ایجادات کی آلائشوں سے پاک ہو اور بجائے ہوس اقتدار اور حرص تعیش کے اخلاقی اور روحانی قوتوں کو برقرار رکھے۔

شاید برق صاحب کے نقطۂ نگاہ سے ان انبیاء کی بعثت اور ان کے صحابہ کا اٹھان معاذ اللہ ایمانداری اور اس کے شعبوں کی تخریب کے لئے تھا؛ اگر ایمانداری یہی دنیاداری اور اس کی تمدنی ترقیات تھیں جنہیں مادہ کی توڑ پھوڑ سے بمشابہت حق تعالے حاصل کیا گیا تھا۔ تو ان نائبان الٰہی کو اس ایمانداری کے مٹانے اور اس کی جگہ معاذ اللہ ملائیت کی ناواقفی، جہالت اور

منشارالٰہی سے بے خبری کو قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

غور کیا جائے تو یہ فرق وہی نقطۂ نظر اور ذوق و ذہنیت کا ہے، برق صاحب جس ذوق سے قرآن کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ اس کی رو سے یقیناً اسلام کا چہرہ معکوس نظر آتا اور اس کے محاسن کا معائب نظر پڑنا ناگزیر تھا۔ انہوں نے مرعوبانہ ذہنیت سے قرآن کو ملحدانِ یورپ کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا تو انہیں ایمانداری بھی مہلک دنیا داری نظر آئی۔ اگر وہ خیر القرون کے نقطۂ نظر سے دیکھتے تو انہیں ایمانداری انبیاء کی سادہ معاشرت تکلفات اور تلذذات سے مبرا زندگی اور خدا پرستانہ روحانیت و اخلاقیات میں نظر پڑتی اور ان کے کلام سے اسلام کا قرن اول اس طرح ضعیف الایمان قلیل العلم اور محروم العمل ثابت نہ ہوتا۔ لیکن اگر قرن اول کی مقدس شخصیتوں اور اس پاک دور کی خصوصیتوں سے الگ ہو کر خالص اصولی حیثیت سے برق صاحب کی نام بہ دہ ایمانداری کا یہ نقشہ قرآن کریم پر پیش کیا جائے تو اس کی کھلی کھلی تصریحات سے بھی یہ آج کی دنیاداری ایمانداری ثابت نہیں ہوتی اور نہ ہی آج کے مہلک تمدن کی یہ گرم بازاری منشار قرآنی سے کوئی جوڑ ہی کھاتی ہے۔ بلکہ قرآنی آیتیں اس نقشے کو سرے ہی سے مٹا ڈالنے کا پروگرام پیش کر رہی ہیں۔ چنانچہ قرآن نے اس مادی دنیا اور خالص مادی گھروندے کو مطلوب یا مقصود زندگی باور کرانے کے بجائے حقارت آمیز عنوانوں سے رد کرتے ہوئے ایمانداروں کو اس سے

ہٹانے اور بیزار بنانے کی سعی کی ہے۔ کہیں اس نے پوری دنیا کو جس میں یہ حق صاحب کے فرمودہ گیس و بخار اور ایجادات کے نئے سے نئے نمونے سب شامل ہیں۔ متاع قلیل کہہ کر اس کی تحقیر کی جس کا مقصد اس سے بے التفات بنانا ہے فرمایا۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ — اے نبی کہہ دو کہ دنیا کا سامان قلیل ہے اور
وَّالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى — آخرت متقی لوگوں کیلئے بہترین سامان ہے۔

کہیں پوری دنیا کو لہو و لعب اور بے حقیقت کھیل کود بنایا جس پر بے عقل اور طفلانہ مزاج انسان ہی ریجھ سکتے ہیں۔ فرمایا۔

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ — یاد رکھو دنیا کی زندگی کھیل کود ہے

کہیں پوری دنیا کو دھوکہ کی ٹٹی فرمایا جس پر سبک دماغ ہی لٹو ہو سکتے ہیں فرمایا۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ — دنیا کی زندگی دھوکہ کی ٹٹی ہے۔

کہیں پوری دنیا کو آفتوں سے ماری ہوئی کھیتی کہا جس کا آغاز سرسبز اور انجام اجاڑ ہو فرمایا:

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا — دنیا کی زندگی کی مثال اس پانی جیسی ہے جو
كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ — آسمان سے برس کر زمین کی پیداوار میں شامل ہو گیا
فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ — جس کو انسان اور حیوانات کھاتے ہیں
مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ — حتیٰ کہ جب زمین کی پیداوار پورے آب
حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ — تاب کو پہنچ گئی اور آراستہ پیراستہ ہو گئی
زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ — اور لوگ یہ سمجھنے لگے کہ وہ اس سے

اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ	فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں تو ہمارا حکم
عَلَيْهَآ اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا	(عذاب) رات یا دن کے وقت آپہنچا پس وہ
اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا	تمام پیداوار نیست و نابود ہوگئی۔ گویا کل کے
كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ	دن کیلئے ان کے پاس کچھ باقی نہ رہا۔

کہیں پوری دنیا کے حاصل (زن زر زمین) کو صورت بے حقیقت، نمائش بے روح، نمود بے بود، اور محض ظاہری ٹیپ ٹاپ بتاتے ہوئے شہوت پرستوں کا محبوب بتایا فرمایا۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ	آراستہ کی گئی ہیں لوگوں کے واسطے عورتیں
مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ	اولاد اور مال و دولت سونے چاندی نشان
الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ	لگائے ہوئے گھوڑے جانوروں کی
وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ	محبت۔ یہ ہے دنیا کا سامان
ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ	اور اللہ کے نزدیک ہی ہے
عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ	حسن انجام

کہیں لذات دنیا میں منہمک رہنے والوں کے بارہ میں جاہل اور احمق ہونے کی تلمیح کی فرمایا

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا	جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں
بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا	رکھتے اور دنیا کی زندگی پہ راضی
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ	اور مطمئن ہو گئے اور جو لوگ ہماری
اُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ	نشانیوں سے غافل ہیں یہی وہ لوگ ہیں

بِمَا كَانُوا يَكْسِبُوْنَ ۝ — جن کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ ان اعمال کی پاداش میں جن کے وہ مرتکب ہوئے ہیں۔

کہیں لذاتِ دنیا میں منہمک رہنے والوں کے بارہ میں جاہل اور احمق ہونے کی تلمیح کی۔ فرمایا۔

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا — ان کو چھوڑ دو۔ کھانے پینے دو مزے اڑانے
وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ — دو باطل آرزوئیں انکو خدا سے غافل بنائے
يَعْلَمُوْنَ ۝ — رکھیں گی۔ مگر وہ ضرور جان جائیں گے۔

کہیں دنیا کی مالی فراوانی اور افزائش گویا باصطلاح عوام ننانوے کے پھیر کی خاصیت گرفتاری لہو ولعب یا بدانجام مشاغل میں پھنس جانا بتلایا۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ — غفلت میں رکھا تم کو بہتات کی حرص نے
الْمَقَابِرَ — یہاں تک کہ جا دیکھیں قبریں۔

کہیں دنیا کے مال کے جمع واکتناز۔ ذخیرہ بازی (ذخیرہ اندوزی) اور آج کی اصطلاح میں سرمایہ داری پر عذاب الیم کی دھمکی دی۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ — جو لوگ سونے چاندی کو جمع کر کے رکھتے
وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ — ہیں۔ اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ — اے نبی تم ان لوگوں کو دردناک عذاب
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ — کی بشارت سنا دو۔

کہیں بے تحاشا کھانے پینے اور عیش دنیا میں غرق ہو جانے کو بہائم سے تشبیہ دے کر ان کا انجام جہنم بتلایا۔ فرمایا۔

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ	یہ لوگ اسی طرح کھاتے پیتے ہیں
الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًی	جس طرح جانور کھایا پیا کرتے ہیں
لَّهُمْ ط	ان لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

کہیں دنیا کے باغ وبہار کی بے ثباتی دکھلا کر اور اس کے پجاریوں کی بدانجامی دکھا کر عبرت دلائی اور اس سے بیزار بنانے کی ہدایت فرمائی ہے فرمایا

کَمْ تَرَکُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ	کس قدر باغات چشمے اور کھیتیاں
وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ کَرِیْمٍ ہ	اور عمدہ عمدہ مقامات اور نعمت جسمیں
وَّنَعْمَةٍ کَانُوْا فِیْهَا فٰکِهِیْنَ ہ	وہ لوگ مزا اڑا رہے تھے چھوڑ گئے۔
کَذٰلِکَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا	اسی طرح ہم نے اس زمین کا وارث
اٰخَرِیْنَ فَمَا بَکَتْ عَلَیْهِمُ	دوسری قوم کو بنا دیا تو ان پر نہ زمین
السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا کَانُوْا	روئی اور نہ آسمان اور نہ ان کو
اِذًا مُنْظَرِیْنَ ہ	کسی قسم کی مہلت دی گئی۔

کہیں اپنے پیغمبر پاک کو ہدایت فرمائی کہ دنیا کی اس چند روزہ ٹیپ ٹاپ کی طرف کوئی ادنیٰ التفات نہ کریں کہ یہ فتنہ اور بلا ہے۔ بلکہ صرف طلب آخرت اور فکر عاقبت میں منہمک رہیں۔ فرمایا

وَلَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَا	مت پھیلاؤ اپنی دونوں آنکھوں کو
مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ	ان چیزوں کی طرف جو ہم نے ان لوگوں

زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى۔	کو دنیاوی زندگی میں عطا کی ہیں۔ اس لئے کہ یہ سب کچھ ان کی آزمائش کے لئے ہے تیرے رب کا رزق بہتر اور ہمیشہ رہنے والا ہے

یہ دنیا کے اس حصہ کی مذمت تھی جس کا تعلق باہ اور شہوت سے ہے بعینہٖ اسی طرح دنیا کے اس حصہ کی بھی قرآن نے مذمت کی جس کا حصّہ تعلق جاہ اور نخوت سے ہے۔ یعنی یہاں کا زور تمکنت، قوت کی حرارت عددی اکثریت اولاد کی کثرت بھی خدا کی طاقت کے سامنے کچھ نہیں بنا سکتی۔ اس لئے مال کو مقصود زندگی سمجھ کر اس میں عمر عزیز گنوا دینا بالآخر حرمان و خسران کا باعث ہے۔ اس لئے قرآن نے کہیں دنیا کی مادی شوکت و قوت، فراوانی مال و دولت، اولاد و افراد کی کثرت، اور نفسانی لذت و فرحت کے حصہ سمیٹتے رہنے کو دنیا و آخرت میں بربادی عمل اور ناقابلِ تلافی گھاٹا قرار دیا۔ فرمایا

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۭ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ	جس طرح تم سے اگلے لوگ زیادہ تھے تم سے زور میں اور زیادہ رکھتے تھے مال اور اولاد پھر فائدہ اٹھا گئے اپنے حصہ سے پھر فائدہ اٹھایا تم نے اپنے حصہ سے جیسے فائدہ اٹھا گئے تم سے اگلے اپنے حصّہ سے اور تم بھی چلتے ہو ان ہی کی

كَالَّذِيْ خَاضُوْا اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ	سی چال - وہ لوگ مٹ گئے ان
اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ	کے عمل دنیا میں اور وہی لوگ بڑے
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ٥	نقصان میں ہیں۔

کہیں ان مادی شوکت و قوت کے نظر فریب سامانوں ٹینک اور ویلپین - بم، گیس اور توپ و تفنگ وغیرہ - اور عددی اکثریت کے لشکروں پر بمقابلہ طاقت اخلاق و روحانیت، بھروسہ کر بیٹھنے کو انتہائی ضعف اور انجام کی ہلاکت قرار دیا - فرمایا

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ	ان سے پہلے ہم نے کتنے ہی لوگوں کو ہلاک
هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِئْيًا	کر ڈالا جو ساز و سامان اور حسن ظاہری
قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ	رکھتے تھے - کہہ دو کہ جو لوگ گمراہی میں مبتلا
فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا حَتّٰٓى	ہوتے ہیں خدا ان کی رسی کو دراز کر
اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا	دیتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی آنکھوں دیکھ
الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ	لیتے ہیں اس چیز کو جس کا ان سے وعدہ کیا
فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ	گیا ہے - عذاب یا قیامت پس وہ لوگ
شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ	جائیں گے کہ کون بدترین از روئے مقام کے اور
جُنْدًا	قوت و طاقت کے لحاظ سے کمزور ہیں۔

کہیں دنیا کے ان رسمی رضاکاروں اور مددگار جتھوں کی بابر نگاہ عددی اکثریت کا

کھوکھلا پن ظاہر فرماتے ہوئے ان طاقتوں پر بھروسہ رکھنے والوں کو ناعاقبت
ناشناس اور بالآخر بے یار و مددگار رہ جانے والا بتلایا۔ فرمایا

حَتّٰٓی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ — یہاں تک کہ جب دیکھیں گے جو وعدہ ہوا
فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا — تھا ان سے سو تب معلوم کر لیں گے کس کا کمزور
وَّاَقَلُّ عَدَدًا — ہے مددگار اور کس کا کم ہے عدد۔

بہر حال عیش و نشاط کے وافر سامان ہوں یا قوت و شوکت کے مضبوط
وسائل اسباب رزم ہوں یا وسائل بزم دربار سے متعلق کروفر ہو یا بازار
سے متعلق سیم و زر جو آج کی نہیں ہمیشہ کی دنیا پرست اقوام کا سرمایہ
سرور و غرور رہا ہے اور آج اسی سرور و غرور کو تلبیس آمیز عنوانات سے دین و
ایمان اور خلافت و اطاعت پکارا جا رہا ہے۔ قرآن کے نزدیک یہ دونوں
ہی شعبے بذاتہٖ لایعنیا یہ اور انتہائی بے حقیقت ٹیپ ٹاپ ہیں جنہیں مقصود
زندگی یا دین و آئین سمجھنا ناعاقبت اندیشی اور ہلاکت کوشی فرمایا گیا ہے۔

پھر اس بارہ میں قرآن نے محض اصولی ہی دعوی نہیں کیا بلکہ واقعات
کی شہادت سے جگہ جگہ اقوام سابقہ کی تباہی کی مثالیں بھی پیش کیں۔ کہ ان
چند روزہ بہاروں میں آکر وقتی عیش و لذت کے سرور و غرور میں مبتلا ہو کر اور
اس تعیش کی افزائش کے لئے دماغی کاوشوں سے اختراعات و ایجادات میں
غرق ہو کر بڑی بڑی جابر قومیں آن کی آن میں کس طرح برباد کر دی گئیں کہ آج ان

کا کوئی نام و نشان بتلانے والا بھی نہیں قوم نوح طوفان کے تھپیڑوں سے، قوم عاد آندھیوں کے جھکڑوں سے، قوم ثمود ہولناک گرج اور غیبی چنگھاڑ سے، قوم شعیب آسمان کی آتش باری سے، قوم لوط فضا کی سنگباری اور بستیوں کے الٹ دیئے جانے سے، قوم ابراہیم سلب نعمت ملک سے، قوم فرعون قلزم کی موجوں سے اس طرح بے نشان کر دی گئیں کہ نہ ان پر آسمان رویا نہ زمین۔

مصریوں کی سائنٹیفک ترقیات بے نظیر باغات، خوش نما آبشاریں، سرسبز کھیتیاں دلفریب سبزیاں اسباب عیش و نشاط، فرعونی دماغ کے مجوزہ سر بفلک منارے جن کی مدد سے وہ آسمان کے دروازوں کے قریب ہو کر موسیٰ کے خدا سے مقابلہ کا حوصلہ کر رہا تھا۔ ان کے لئے کچھ بھی کارآمد ثابت نہ ہوئے۔ اور یہی ساری سائنٹیفک ترقیات فرعون اور فرعونیوں کے حق میں موجب ہلاکت و تباہی بنیں۔ اور بالآخر نام اور کام باقی رہا تو موسیٰ علیہ السلام اور ان کی سادگی و بے تکلفی کا یا با صطلاح برق صاحب خالص ملائیت کا۔

عاد و ثمود کو ان کی سائنسی ترقیات اور فنکاریوں کی بے مثال تعمیر و ترقی عاد کی فن انجینئری کے تحت نادر روزگار سر بفلک بلڈنگیں اور قوم ثمود کی وہ پہاڑوں سے تراشی ہوئی قلعہ بند عمارتیں اور منزل در منزل تعمیریں اس

محسوس

عذابِ خداوندی سے بچا سکیں جو اپنی نمائشی بہاروں میں غرق ہو جانے کے سبب ان پر آیا اور جس کے سبب قرآن نے ان کے خالص مادیت کے شاہکاروں اور اخلاق و روحانیت سے ہٹے ہوئے کارناموں کو مقصودِ زندگانی قرار دے لینے کو نفرت سے حقارت سے یاد کیا ہے جس کا مفہوم قطعاً یہ نہیں نکلتا کہ یہی دنیاداری عین ایمانداری ہے ورنہ اس ایمانداری کو بے نام و نشان کر دینے اور رسوائے عالم یاد کرانے کے لئے قرآن کی یہ آیتیں نہ اترتیں بلکہ ان اقوام کی سائنٹیفک ترقیات کو سراہا جاتا اور عذاب کے بجائے ان پر انعامات الٰہیہ اترتے۔ قرآن ان کے مناقب بیان کرتا کہ انہوں نے منشاءِ خداوندی کو پورا کیا اور مسلمانوں کو ان سے ہٹانے کے بجائے ہدایت دیتا کہ وہ ان اقوام کے نقشِ قدم پر چلیں نہ کہ انبیاء کے جنہوں نے ان کی ان ساری ترقیات کو میٹ دینے کے راستے تیار کئے لیکن قرآن نے بتلایا کہ جب یہ مادی مشاغل ان کی ایمانداری میں حارج ہوئے اور ان فانی لذات میں پڑ کر ان قوموں نے فرائضِ عبودیت ترک کر دیئے انبیاء کی تعلیمات کو ٹھکرا دیا تو قہرِ خداوندی نے انہیں نیست و نابود کر کے دنیا کو عبرت دلائی کہ ان کے نقشِ قدم سے ہی دور رہیں اور اس راہ نہ چلیں۔ پھر قرآن کو سب سے زیادہ سمجھنے اور اس پر سب سے زیادہ عمل پیرا ہونے والی ذات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدس ہے۔ آپ نے اس بارہ میں جو عملی نمونہ اور استعمالی اسوہ پیش فرمایا۔ درحقیقت وہی ان آیتوں کا صحیح مفہوم اور سچا مصداق ہے۔ سو آپ نے ان سائنٹیفک اختراعات

اور مادی لذات کو مقصود زندگی سمجھ کر ان میں ترقی کرنا تو بجائے خود ہے ان سے علی الاطلاق فائدہ اٹھانا اور لذت اندوز ہونا بھی گوارا نہیں فرمایا۔ بلکہ بقدرِ ضرورت اور وہ بھی باختصار ضرورت اور اس پر بھی بکمال قلت اور اس قلیل قلیل کو بھی محض مصلحت دین و روحانیت نہ بلحاظ حظ نفس اختیار فرمایا اور پھر بھی اس سے بے تعلقی کا اعلان فرما دیا کہ

مَالِيَ وَلِلدُّنْيَا إِنَّمَا أَنَا — مجھے دنیا سے کیا تعلق؟ میں تو ایک گھوڑے
كَرَاكِبٍ خَيْلٍ تَحْتَ ظِلِّ — سوار کی مانند ہوں (جو سفر میں ہو اور
شَجَرَةٍ (الخ) — دم لینے کے لئے کچھ دیر) ایک درخت

کے سایہ کے نیچے بیٹھ جائے (اور پھر چلنا شروع کر دے پس دنیا ایک چلتا پھرتا سایہ ہے اور مسافر آخرت برائے چندے اثنار سفر میں اس کے نیچے دم لے لیتا ہے تاکہ پھر سفر شروع کر دے اور بدستور مقاصد عبودیت پورے کرنے میں لگا رہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ اس پاک ذوق کے ماتحت یہ رہی ہے کہ آپ نے بیت نبوت میں کبھی ایک حبّہ زر و سیم کا جمع رکھنا گوارا نہیں فرمایا۔ اتفاق سے ایک بار ایک آدھ دینار گھر میں رہ گیا جو آپ کو عین مغرب کی نماز کی تکبیر ہو جانے پر یاد آیا تو اسی وقت مصلیٰ سے ہٹ کر گھر میں تشریف لائے اسے صدقہ فرمایا اور پھر آ کر نماز شروع فرمائی اور فرمایا کہ بیت نبوت کے لئے زیبا نہیں کہ اس پر رات گزرے اور اس میں سونا چاندی ہو۔ گھر میں مہینوں دھواں

نہیں اٹھاتا تھا اور آپ فقر و فاقہ کو بصد شوق و رغبت عزیز رکھتے اور فرماتے
اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا اے اللہ محمد کے اہل بیت کا رزق قوت لایموت
ہی رہے (جس میں افراط نہ ہو) آپ امت کے فقر و فاقہ اور ناداری سے خوف نہ
کھاتے تھے۔ بلکہ دنیوی تمول اور دولت داری سے خائف تھے۔ کہ وہ امت
کے لئے ہلاکت ہے۔ امت کو ہدایت فرماتے کہ اقوام عالم پر تمہارا غلبہ زر و
مال سے نہ ہوگا۔ بلکہ اخلاقِ محمدی سے ہوگا۔ جمع مال کی ترغیب نہیں دیتے بلکہ
اسے بے عقلی کی نشانی فرماتے ہیں۔ حرص مال پر آمادہ نہیں فرماتے بلکہ قناعت پر
ابھارتے ہیں۔ بلند عمارات کو پسند نہیں فرماتے پست اور بقدر ضرورت عمارت کو
جائز رکھتے ہیں۔ کسی کی اونچی عمارت دیکھتے ہیں تو گرانی اور ناپسندیدگی کا اظہار
فرماتے ہیں اور عمارت والے آپ کے منشا کو پاکر اسے منہدم بھی کر دیتے ہیں ازواج
مطہرات کے لئے تنگ و تاریک حجروں کی معاشرت پسند فرماتے ہیں جن پر کھجور
کے پتوں کی چھت تھی اور مٹی سے اُسے لیپ دیا گیا تھا۔ لباس فاخرہ کو ہاتھ نہیں
لگاتے اور کسی کی خاطر کوئی ایسا لباس ہدیۃً پہنتے بھی ہیں تو گھبرا کر فوراً اتار دیتے ہیں
اور وہی اپنی پیوند دار کملی طلب فرماتے۔ لذیذ کھانوں سے بے تعلق رہتے ہیں۔
اور تفنن طعام کو ناپسند فرماتے ہیں۔ عمر بھر کے کھانے کی مقدار میں چند من جو ہیں۔
جن کا بھوسہ بھی روٹی میں شامل رہتا ہے۔ بچھونے کے لئے فرش خاک اور اس پر ایک
معمولی کمبل زیر پشت رکھتے ہیں۔ دولت کی افزائش کے لئے احتکار گرانی نرخ

کی امید پر مالِ تجارت روکے رکھنا) کو روکتے ہیں۔ سود کو حرام قرار دیتے ہیں۔ قمار کو ممنوع فرماتے ہیں۔ زکاۃ کی مذمت فرماتے ہیں۔ سیم وزر کے برتنوں کو ناجائز فرماتے ہیں۔ دیوار ہائے مکان پر منقش پردوں کی نمائش کو مکروہ جانتے ہیں سادہ لباس و حلیہ کو شعار بناتے ہیں اور فیشنوں کی کاٹ تراش سے بے تعلقی اختیار فرماتے ہیں۔ دنیا کی ٹیپ ٹاپ تو بجائے خود رہی سرے سے دنیا ہی کو پسند نہیں فرماتے۔ دنیا و مافیہا کو ملعون فرماتے ہیں۔ دنیا کو مومن کے لئے جیل خانہ فرماتے ہیں۔ دنیا کو بے گھروں کا گھر فرماتے ہیں۔ دنیا کو مبغوض خداوندی فرماتے ہیں۔ محبت دنیا کو وسیلۂ جہنم قرار دیتے ہیں۔ غرض ان تمام وسائل تمدن اور مادہ کی سائنٹیفک ترقیات ماکولات، مشروبات، مسکونات، ملبوسات وغیرہ ہیں جن کی خدمت اختراع و اکتشاف کے سلسلہ میں سائنس بے تحاشا دوڑ لگا رہی ہے۔ آپ نے وہ نمونۂ عمل پیش فرمایا کہ اس میں دنیا طلبی کا مبالغہ تو بجائے خود ہے سرے ہی سے دنیا طلبی کا کوئی نشان یا دنیا سازی کا کوئی نام یا دنیا بازی کا کوئی ادنیٰ نقش تک نہیں پڑتا۔ بلکہ بقدر ضرورت اختیار کرتے ہیں بھی انتہائی تقلیل، انتہائی احتیاط اور انتہائی بے تعلقی کا اسوہ سامنے آتا ہے۔ جس سے قرآن کی عرض کردہ آیات کا مفہوم اور مصداق متعین ہو جاتا ہے کہ منشاء خداوندی یہ دنیاداری نہیں بلکہ ایمانداری ہے جو اس دنیاداری کی ضد ہے۔ چہ جائیکہ یہ دنیاداری ہی عین ایمانداری ثابت ہو۔

ذرا دارادہ - ممدوحہ۔

پھر پیغمبر کی ذاتی زندگی سے (جو اعلیٰ ترین عزیمتوں اور بلند ترین ہمتوں کا مجموعہ ہے) نیچے اتر کر بھی اگر اس دنیاداری اور اس کے ان تمدنی مبالغوں کو شریعت کے عام قواعد پر پرکھا جائے جن میں دنیوی لحاظ سے توسع اور کافی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ دنیا کی ہر خداپرست قوم انہیں اختیار کر سکے تب بھی اس پوری دنیا کی حیثیت ایک وسیلۂ آخرت سے زیادہ ثابت نہیں ہوتی جس میں ذاتی مقصودیت اور مطلوبیت و محبوبیت کا کوئی شائبہ نہیں نکلتا

ارشاد نبوی ہے۔

إِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَ — بلا شبہ دنیا تمہارے لئے بنائی گئی ہے اور

إِنَّكُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ — تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔

اس شکل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دنیا تمہاری آخرت کے لئے بنائی گئی ہے۔ یعنی وسیلۂ آخرت ہے مقصود زندگی نہیں قرآن حکیم نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ — میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف

إِلَّا لِيَعْبُدُونِ — عبادت کیلئے پیدا کیا ہے۔

یعنی دنیا اور دنیاداری کی خاطر پیدا نہیں کیا کہ یہی کلمۂ حصر کا مفہوم ہو سکتا ہے اور جب دنیا غایت تخلیق نہیں تو لامحالہ پوری دنیا کا وسیلۂ عبادت ہونا ثابت ہوتا ہے۔

ایک موقعہ پر بذیل دعا لسان نبوت میں اس حقیقت کو ظاہر فرمایا

گیا۔ ارشاد نبوی ہے۔

اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی دِیْنِیْ	اے اللہ میرے دین کو دنیا کے ذریعہ
بِالدُّنْیَا وَعَلٰی اٰخِرَتِیْ	مدد دے اور میری آخرت کو پرہیزگاری
بِالتَّقْوٰی۔	سے۔

بہرحال ان نصوص سے دنیا وسیلۂ دین ثابت ہوتی ہے۔ اور عقلی اصول ہے کہ وسائل صرف تکمیل مقاصد کے لئے بقدر ضرورت اختیار کئے جاتے ہیں۔ اگر وہ ضرورت سے بڑھ جائیں یا ضد مقصود کے لئے وسیلہ ثابت ہونے لگیں یا مقصد فوت ہو کر محض وسائل ہی وسائل رہ جائیں۔ گویا تخم تو گل جائے اور جڑیں یا پانی ہی پانی رہ جائے جو تخم کے نشوونما کا محض ایک وسیلہ تھا تو یہ شرعاً ہی نہیں عقلاً بھی مذموم سمجھا گیا ہے اور اس میں کاشت اور کاشت کار دونوں کی تباہی ہے۔ گویا یہ تمام سامانِ دنیا بدن کی پرورش اور بقا کا ذریعہ ہے۔ اور بدن روح کے لئے مرکب اور سواری ہے جس پر سوار ہو کر وہ راہِ حق اور آخرت کی منزلیں طے کرتی ہے۔ اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ بدن کے اس گھوڑے کے لئے گھاس دانہ فراہم کرے تاکہ وہ سفر کرنے کے قابل ہو۔ پس سفر سے مقصود منزل ہوتی ہے نہ کہ گھوڑا یا گھاس دانہ، اس صورت میں اگر مقصد سفر ہی سامنے نہ ہو تب تو سواری اور گھاس دانہ ہی کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن جس صورت میں مقصد سامنے

ہو تو تحصیل مقصد کی حد تک سواری کا بندوبست کرنا ناگزیر ہوتا ہے مگر وہ وسیلہ ہی رہتی ہے۔ مقصد نہیں بن جاتی۔

مادی طاقتوں پر بھروسہ کرنیکی بنیادی علت

ہاں پھر اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ منزل مقصود سامنے ہو اور سفر کے لئے کوئی دوسرا قریبی وسیلہ ہاتھ لگ جائے تو پھر بعید وسیلہ کی طرف طبعاً التفات باقی نہیں رہتا بلکہ اسے قریب قریب ترک کر دیا جاتا ہے۔ غور کیجئے کہ سفر آخرت کی منزل مقصود وصول الی اللہ بلکہ قبول عند اللہ ہے اس کے لئے حسب بیان بالا دنیا کے یہ تمام اجزا رمال وجاہ ہتھیار، اوزار، افراد کے اعداد و شمار اور روٹی دکرسی وغیرہ وسائل ضرور ہیں مگر وسائل بعیدہ ہیں کیونکہ منزل مقصود باطنی اور معنوی ہے اور یہ اسباب ظاہری اور مادی ہیں ظاہر و باطن اور مادہ و روح میں بہرحال بون بعید ہے۔ اس روحانی مقصد کے لئے وسائل قریبہ جو اسے سامنے سے آتے ہیں قوت یقین، تقویٰ، پرہیزگاری، دیانت راست بازی۔ توکل، محبت حق اتباع طریق انبیاء اور غیر اللہ سے استغنار وغیرہ ہیں۔ یعنی مادی طاقت سبب بعید ہے اور اخلاقی طاقت سبب قریب

ظاہر ہے کہ اگر کسی کے پاس یہ باطنی وسائل کی اخلاقی طاقت مضبوط اور منضبط شکل میں موجود ہو تو اسے قدرتاً ان مادی اور رسمی وسائل کی بودی طاقت کی طرف توجہ ہی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اسے ان وسائل بعیدہ کی زیادہ حاجت ہی پڑے گی جبکہ وہ وسائل قریبہ سے ہمکنار ہے اور منزل مقصود اس سے آلگی ہے۔

اس رسمی وسائل کی طاقتوں پر بھروسہ اسی وقت بڑھتا ہے جب اصلی طاقت پاس نہیں ہوتی جیسے کسی شخص کی اصلی صحت قائم نہ رہے تو وہ دواؤں کے بل بوتہ پر اپنی صحت برقرار رکھنے کی فکر میں ڈوبا رہے اور اس عارضی صحت ہی کو صحت باور کرنے پر مجبور ہو جائے حالانکہ دواؤں سے حاصل شدہ صحت اصلی صحت نہیں بلکہ ایک مستقل روگ ہے جسے یہ بوجہ غلط مریض مرض سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ لیکن جس کے بدن میں اصلی صحت راسخ ہو وہ نہ صرف دواؤں کو مڑ کر ہی نہیں دیکھتا بلکہ ان سے حاصل شدہ عارضی اور مصنوعی صحت اور اس کے عمل تحصیل کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے ۔

آج یورپ کے ہاتھ میں اخلاقی طاقت نہیں اس لئے اسے ان مادی وسائل میں غرق ہو کر ان مصنوعی اور سطحی اور عارضی طاقتوں پر بھروسہ کرنا پڑ رہا ہے ۔ اگر اس کے پاس اخلاق کی معنوی قوت اور یہ اصلی طاقت ہوتی تو وہ یقیناً اس مصنوعی اور بناوٹی طاقت کے فریب میں مبتلا نہ ہوتا۔ دنیا طبعاً اس کے ہاتھ میں مسخر ہوتی اسے جبراً اور کرہاً مسخر کرنے اور ان آہنی نقرئی اور طلائی وسائل

کے زور سے اسے دبانے رہنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ مسلم قوم کو یہ معنوی طاقت مستند اور مضبوط شکل میں دی گئی تھی اس لئے اس نے اپنے ابتدائی اور بعض درمیانی دوروں میں جب کہ اس کی یہ اصلی صحت قائم تھی۔ عظیم تاریخی کارنامے انجام دیئے۔ وہ ان مادی وسائل سے بالاتر اسباب یعنی اسی اخلاقی طاقت کا ثمرہ تھے جس میں نہ افراد کے اعداد و شمار بنیادی کار تھے۔ نہ سیم و زر اصل تھا نہ ان چیزوں کا وجود ضروری تھا۔ یہ وسائل بقدر حاجت استغنار کے ساتھ اختیار کئے جاتے تھے تاکہ عبدیت و بندگی کی شان ظاہر میں بھی قائم رہے۔ اس حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

إِنَّكُمْ لَنْ تَسَعُوهُمْ	تم دنیا کی اقوام پر اپنے اموال (مادی وسائل)
بِأَمْوَالِكُمْ وَلَكِنْ تَسَعُوهُمْ	سے غلبہ نہیں پا سکتے بلکہ اپنے اخلاق
بِأَخْلَاقِكُمْ	سے غالب آسکتے ہو۔

جوں جوں مسلمانوں میں سے یہ اصلی صحت و قوت جو ان کے اسلامی مزاج کے اعتدال سے تعلق رکھتی تھی۔ اور جس کا جامع عنوان "فکر آخرت" تھا گم ہوتی گئی۔ ووں ووں وہ بھی عام دنیا کی طرح اپنی عافیت و صحت مندی اپنی آہنی اور نقرئی و طلائی وسائل کی دواؤں میں مضمر سمجھتے گئے۔ جو حقیقتاً ان کی نہیں بلکہ دوسروں کی طاقت تھی اور بلحاظ حقیقت وہ طاقت نہ تھی بلکہ بصورت طاقت

کمزوری تھی اور وہ بھی چند روزہ بہار کی مانند بالآخر خرمان وخسران تھی۔
کیونکہ بلا فکر آخرت دنیائے محض نہ تو دنیا ہی ہے کہ دنیا بہر حال رہنے والی
نہیں اور نہ وہ آخرت ہی ہے کہ آخرت بنانے کی اس میں فکر ہی نہیں۔ اس
لئے نہ دنیا رہی نہ آخرت

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذٰلِكَ	دنیا اور آخرت میں نامراد ہوا، یہی
هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ	صریح نقصان ہے۔

مگر جب نقالی کے طور پر مسلمانوں نے بالآخر اس ضعف ہی کو اپنی طاقت سمجھ
لیا اور عام دنیا والوں کی طرح اس کے پیچھے ہو لئے تو ان کی بنیاد کھوکھلی ہوتی
گئی اور باطل کی یہ دبی ہوئی اور مصنوعی طاقتیں جنہیں مسلمانوں کی اخلاقی
طاقتوں نے دبا دیا تھا۔ ان کے مقابلہ پر ابھرنے لگیں اور باطل پرستوں
نے فرصت پاکر اور مادی وسائل کا وہی قیصری وکسروی حربہ یعنی مادی طاقت
جسے اسلام کی روحانی اور اخلاقی طاقتوں نے پامال کر دیا تھا اختیار کر کے
آگے بڑھا دیا۔ اور اسے ترقی دی اور جب اخلاقی قوتوں سے اس کا معارضہ
کرنے والا ہی کوئی نہ رہا تو اس کا حلقۂ اثر وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔ نتیجہ یہ
ہوا کہ آج کے غافل اور محروم اخلاق مسلمان ان مادی طاقتوں کے نیچے اس
حد تک دب گئے کہ ان کے ذہن سے اخلاقی قوتوں کے قوت ہونے کا تصور
بھی جاتا رہا تا آنکہ وہ اپنی مرعوبانہ ذہنیت اور ذہنی غلامی سے خود ہی اپنی اس

موروثی طاقت پر طعنہ زن ہونے لگے جس نے کل تک خود ان بناوٹی طاقتوں کو مرعوب کر رکھا تھا حتیٰ کہ آج ان کے ذہنوں میں فہم کے الٹ جاتے سے قرآن کا مقصد بھی یہی بناوٹی اور مصنوعی طاقت محسوس ہونے لگا خلافت الٰہی کے معنی بھی انہی رسمی مصنوعات میں انہماک اور غرقابی رہ گئے۔ دینداری اور ایمانداری بھی یہی دنیا داری قرار پاگئی۔ منشار خداوندی بھی یہی سائنٹیفک آلات و وسائل بن گئے۔ پسندیدۂ الٰہی بھی وہی قومیں قرار پاگئیں جو ان وسائل کی بندگی اور پابوسی میں سربسجود ہیں۔ اور مرضئ الٰہی بھی وہی ترقی ہوگئی جو آج ان مادی اقوام کے ہاتھوں ان مادی وسائل سے سطح دنیا پر نمایاں ہو رہی ہے۔ جس کا حاصل دنیا کی اقوام پر جبری تغلب و استیلا کر کے اقوام عالم کو دبانا اور انہیں بلبلاتا ہوا دیکھ کر تفریحی ٹھٹھے اور قہقہے لگانا ہے۔ ورنہ اگر ان اقوام کے سامنے کوئی اخلاقی نصب العین مثلاً تہذیب نفس یا تکمیل اخلاق یا اصلاح عالم یا خدائی کمالات سے استکمال نفوس یا معرفت ذات و صفات خداوندی یا وصول الی اللہ اور قبول عنداللہ یا استعداد آخرت یا اقامت دین یا حکمرانی قانون الٰہی وغیرہ ہوتا۔ جو کبھی مسلمان کے سامنے تھا تو طبعی طور پر تغلب و استیلار کے ان تباہ کن وسائل اور نفوس انسانی کو لہو ولعب اور غفلت میں جھونک دینے والے تفریحی وسائل یا تو درمیان ہی میں نہ آتے۔ یا کسی حد تک دفع فتنہ کے لئے آتے تو ان میں مبالغہ وغلو اور مقصودیت کی یہ شان نہ آتی کہ دنیا کی ساری تجارتیں

اور عالم کا اربہا ارب روپیہ انسانوں کی تعمیر کے بجائے صرف انہی مہلکات کی پیداوار کے لئے رہ جاتے۔ اور بالذات یہی چیزیں مقاصدِ حیات کا درجہ حاصل کرکے خلافت الٰہی اور ایمانداری کا لقب پالیتیں جس سے حقیقی ایمانداری اور خلافت حق پیچھے رہ جائے۔ پس قرآن و سنت نے دنیا کی مذمت کرتے ہوئے اسے بالاصالت مقصود بنا لینے اور اس میں مبالغہ و انہماک سے روکا ہے البتہ بقدر ضرورت اور وہ بھی وسیلہ آخرت اور خادم دین کی حیثیت سے کسب کرتے رہنے کی ہدایت فرمائی جس میں کم و بیش کی تخصیص نہیں کی۔ اگر بضرورت دین بالکل اسی قسم کا تمدن اور تمدنی وسائل درکار ہوں جو آج کی دنیا پر چھائے ہوئے ہیں تو وہ ضرور حاصل کئے جاویں گے۔ کیونکہ اسلام ان وسائل سے نہیں روکتا۔ بلکہ انہیں غایۃ مقصود بنانے سے روکتا ہے پس انتہائی مقصود دین ہوگا۔ اور یہ وسائل تحصیل مقصد کے ذرائع ہوں گے نہ کہ خود بذاتہ مطلوب اور ظاہر ہے کہ اس نکھرے ہوئے تصور کے بعد یہ غلو آمیز ترقی اور اس پر فخر و مباہات کی صورت قدرتاً پیدا ہی نہیں ہوگی پس کہاں ملحدان مغرب کی دنیا پرستی اور اس پر فخر اور کہاں موحدان اسلام کی خدا پرستی اور دنیا گذاری

ع:۔ شتان بین مشرق و مغرب

رہیں وہ آیات و روایات جس میں کائنات کی مصنوعات یا تخلیق کے عجائبات اور آسمان و زمین وغیرہ کی گوناگوں پیداوار عناصر و موالید اور ثوابت

عہ اس میں مشرق و مغرب کا سا تفاوت اور فرق ہے ۔ ۱۲

وسیارات وغیرہ کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ سو وہ فن سائنس سکھانے اور اس میں موشگافیاں کرکے صنعت وحرفت کا کاروبار جاری کرنے کے لئے نہیں اتاری گئیں بلکہ صنائع الٰہی ہیں دعوت نظر و فکر دے کہ معرفتِ خالق کا سراغ لگا لینے کے لئے نازل کی گئی ہیں۔ یعنی یہ کائناتی قرآن (آسمان و زمین برق و بخار آب و ہوا عناصر و موالید اور ان کے افعال و خواص وغیرہ) جن کو برق صاحب نے عملی قرآن کہا ہے۔ اس علمی قرآن کا وہ مطلوبہ عمل نہیں جس کا بندوں سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ قرآن پڑھ کر اس کائناتی صنعت وحرفت کا کاروبار پھیلائیں۔ کیونکہ یہ تو قرآن اتارنے والے کا عمل ہے۔ جس کی ان آیتوں نے خبر دی ہے۔ ان میں یہ مطالبہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ان حکایتوں کے محکی عنہ کے مماثل کوئی صنعت بنائیں گویا بندے بھی خدا کی طرح ایک زمین و آسمان تیار کریں یا چاند سورج بنا لائیں بلکہ مطالبہ یہ ہے کہ خدا کی ان محیر العقول عجائبات میں سلامتی فکر کے ساتھ تدبر کرکے بنانے والے کی طرف نیاز مندانہ اور معترفانہ رجوع کریں اسے پہچانیں۔ اور یقین کریں کہ یہ مصنوعات وہی بنا سکتا ہے جس کی قدرت لامحدود ہے۔ نہ وہ انسان جس کی قوتیں نہایت محدود اور ضعیف ہیں۔ اور اس طرح بندے اس کی اس مافوق العادت صناعی سے اس کی خدائی کے قائل اور معترف بنیں۔ اور اس کے محسنانہ حقوق پہچان کر ان کی ادائیگی کی فکر کریں۔ پس یہ کائنات آیاتِ قرآنی کے مطلوبہ عمل کی عمل گاہ نہیں بلکہ عارف مزاج

انسانوں کے لئے ایک فکرگاہ ہے جس میں غور و تدبر کرنے سے قرآن کے
نظریات حل ہوتے ہیں۔ اور قرآنی دعاوی کے لئے ایسے تمثیلی اور برہانی
دلائل ہاتھ لگتے ہیں۔ جن سے قرآنی مقاصد بآسانی ذہن میں اتر جائیں۔
بالفاظ دیگر قرآن ایک دعویٰ ہے اور کائناتِ عالم اس کے لئے ایک
عادل گواہ ہے جس کی شہادت سے یہ دعویٰ ثابت اور واجب التسلیم ہو جاتا
ہے۔ یعنی قرآن کے دقیق معقولات کو اس کائنات کے محسوسات سے تمثیل
دے کر بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ شہادت خود مقصود
بالذات نہیں ہوتی بلکہ اثبات مدعا اصل مقصود ہوتا ہے۔ جس کے لئے
شہادت لائی جاتی ہے اور جب دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے تو گواہوں کو تو رخصت
کر دیتے ہیں۔ اور ثابت شدہ دعوے کو نافذ العمل بنانے کی کوشش کرتے
ہیں۔ پس شہادت خود دعوے کا عمل نہیں ہوتی۔ بلکہ بوجہ اثبات مدعا وسیلۂ
عمل یا معین عمل ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح صحیفۂ کائنات کا مطالعہ اس
لئے ضروری ہے کہ اللہ کے دعاوی اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایات کو اس کے
ذریعہ نظری طور پر سمجھ لیا جائے اور اس تمثیلی برہان سے معقولات قرآنی کو مثل
محسوسات کے یقینی اور قطعی سمجھ کر عقیدہ بنایا جائے اور پھر اس کے مقتضا کو
واجب العمل تصور کیا جائے۔ اور جب یہ دعویٰ ان حسی دلائل سے مبرہن اور
مدلل ہو جائے تو اس کائنات سے تو قطع نظر کر لی جائے اور ان ثابت شدہ

ہدایات کے منشار کے مطابق عملدرآمد جاری کیا جائے۔ پس قرآنی عمل وہ ہوگا
جو ان تکوینی آیات کا تقاضا کردہ ہوگا۔ نہ وہ جو ان آیات کا محکی عنہ اور واقعہ ہوگا
کہ وہ محض دلیل ہے نہ کہ ہدایت اور مدعا پس کائنات کی کھود کرید کا مطلب
اس کا نظری اور استدلالی تجربہ ہے جس سے اثبات مدعا کے مقدمات پیدا
ہوں نہ کہ حسی تجربہ کہ اس کے عنصریاتی اجزا کی کھود کرید کر کے اس جیسی
کائنات بنائی جائے اور اس میں جوڑ توڑ کر کے تمدنی اشیار کے نئے نئے
ڈیزائن اور نمونے تیار کیے جائیں کسی عدالت میں گواہوں کے پیش کیے جانے
کا مطلب ساری دنیا جانتی ہے کہ ان کے اقوال و شہادات کا تجزیہ کر کے ان کی
حیثیت کذائی کو سامنے لا کر دعوے کے سچ جھوٹ کا پتہ لگایا جاتا ہے نہ یہ کہ ان
گواہوں کی ہڈی پسلی توڑ کر ان جیسا ایک پتلا اور تیار کیا جائے یا اس کے اجزائے
ترکیبی میں جوڑ توڑ لگا کر مختلف سامان بنا لیے جائیں جس سے نہ گواہ باقی رہے
نہ دعویٰ۔ پس آیات کائنات ان آیات قرآنی کے لیے دلائل اور گواہ ہیں نہ کہ
ان کا عملی نمونہ یا عمل کا مادہ۔

دوسرے عنوان سے بطور خلاصہ کلام یوں سمجھو کہ قرآن حکیم کی آیتیں دو طرح
کی ہیں۔ ایک انشائی ہیں جن میں کسی چیز کا امر و نہی کیا گیا ہے۔ اور دوسری اخباری
ہیں جن میں ماضی یا مستقبل کے واقعات کی خبریں دی گئی ہیں خواہ افعال عباد ہوں
یا افعال رب العباد۔ ان دونوں ہی قسم کی آیتوں کا مقصد انسان کی عملی زندگی

کی طرف لانا اور کسب سعادت کی طرف متوجہ کر کے ان ہر دو آیتوں کے تقاضوں پر چلانا ہے۔ برق صاحب تو ان آیات پر چلنے کا مطلب خدا کی نقل اتارنے اس جیسا کام کرنے اور اس کی مماثلت کرنے کا لیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک قرآن کا عمل ہی یہ کائنات ہے جو خدا کا فعل ہے اس لئے لامحالہ قرآن پر عمل کرنے کا مطلب خدا کے مماثل کام کرنے کا ہو جائے گا۔ اور ہم اس آیات پر چلنے کا مطلب ان کے تقاضوں سے پیدا شدہ احکام پر عمل پیرا ہونے ان کے مطالبوں کو پورا کرنے اور ان کے مقتضیات کے اتباع کرنے کا لیتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک قرآن کا مطالبہ کردہ عمل یہ کائنات یا اس کا مادہ نہیں بلکہ اس کا مطلوبہ عمل بندہ کے وہ نیازمندانہ اعمال ہیں جو ان آیات کے تقاضوں کو پورا کرنے سے رونما ہوتے ہیں۔ اس لئے پہلا مطلب یعنی مماثلت افعال خداوندی ہمارے نزدیک بوجوہ مذکورہ صرف باطل ہی نہیں بلکہ ناممکن العمل بھی ہے۔ جس کی طلب قرآن حکیم جیسی فطری کتاب میں کبھی نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر حسب زعم برق صاحب بمقتضائے آیات تکوین خدا کی جیسی صنعت کا لے آنا مقتضائے قرآنی ہوتا تو جیسے ان اخباری آیات کا مقتضیٰ یہ ہوتا کہ اس کی جیسی ایک کائنات ہم بھی بنائیں جس کی حکایت یہ اخباری آیات کر رہی ہیں۔ ایسے ہی انشائی آیات کا مقتضا یہ ہونا چاہیئے کہ اس کے جیسا علم اس کے جیسا قانون جو اسی کی جیسی جامع بلیغ اور اعجازی تعبیر پر مشتمل ہو ہم بھی بنائیں جس کی حکایت پر یہ انشائی

آیات مشتمل ہیں۔ گویا بالفاظ مختصر اخباری آیات کے تحت تو ہم ایک متماثل کائنات بنائیں اور انشائی آیات کے تحت ہم ایک متماثل قرآن بنائیں لیکن اگر تشریعی آیات کا مثل لانا ممکن نہیں کہ وہ معجزہ ہے تو تکوینی آیات کا مثل لانا بھی ممکن نہیں کہ یہ بھی معجزہ ہے۔ وہ علمی معجزہ ہے یہ عملی معجزہ ہے۔ وہ اللہ کا اعجازی کلام ہے اور یہ اس کا اعجازی کام ہے اور معجزہ کے معنے جبکہ یہ ہیں کہ وہ بشر کی قدرت سے خارج ہو خواہ علمی ہو خواہ عملی تو ظاہر ہے کہ حکیم مطلق کے کلام میں ایسی چیز کی طلب ہی محال عقلی ہے۔ جو مخاطب کی قدرت سے خارج ہو بلکہ اگر غور کرو تو انشائی آیات میں جہاں مماثلت کے یہ معنے نہیں بن سکتے کہ ہم ان ہی جیسی آیتیں بنا لائیں اور خدا کے جیسا کلام کرنے لگیں۔ وہاں مماثلت کے یہ معنے بھی ممکن نہیں کہ جیسے یہ انشائی آیتیں اللہ کے امر و نہی پہ مشتمل ہیں جن سے اس کا فعل تشریع اور وصف شارعیت کھلتا ہے۔ ہم بھی ویسا ہی امر و نہی کرنے لگیں اور شارع بننے لگیں کہ

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ سوائے خدا کے کسی کا حکم نہیں۔

لیکن اگر برق صاحب کا یہ اصول مان لیا جائے کہ آیت جس چیز کی حکایت کرے اُسی کو بنا کر لے آیا جانا اس آیت کی تعمیل ہے نہ کہ اس کی ہدایت یا مقتضا پر عمل کرنا تو جس آیت میں اللہ کے شارع ہونے کی حکایت ہے وہاں مخاطب کو شارع بن جانا چاہیئے۔ جن آیات میں اللہ کے آسمان و زمین بنانے کی حکایت

ہے وہاں مخاطب کو زمین و آسمان بنانا چاہیئے ۔ جن آیات میں معذب اقوام کی بدعملیوں کی حکایت ہے وہاں انسان کو بدعمل ہوجانا چاہیئے ۔ یعنی جو حکایت ہو وہی عمل بھی ہو ۔ سو ظاہر ہے کہ اس کا بدیہی البطلان ہونا کون محسوس نہ کرے گا ؟ کیونکہ اس میں اخباری آیتوں میں تو فعلی معجزہ کی طلب لازم آتی ہے اور انشائی آیتوں میں کلامی معجزہ کی طلب پیدا ہوتی ہے ۔ اور یا شارع بننے کا مطالبہ لازم آتا ہے ۔ اور یہ دونوں باتیں غیر معقول ہی نہیں ناممکن بھی ہیں ۔ مگر یہ سب کچھ لازم آرہا ہے ۔ برق صاحب کے اصول مذکورہ پر جس کو انہوں نے آیات اخبار اور معاملات تکوین میں اختیار فرمایا کہ جو آیت کا محکی عنہ ہو وہی اس کا موجب بھی ہو کہ اسی کو بعینہ عمل میں لانا آیت کی تعمیل ہو ۔ اس لیئے اس اصول کا اصولاً بھی باطل اور غیر معقول ہونا واضح ہوگیا ۔ اور آیات تکوین میں مماثلت افعال خداوندی کے معنے لیئے جانے بالکل ہی مہمل اور بے معنی ثابت ہوئے ۔

ہاں اگر مماثلت کے معنے قدرتی یا غیر اختیاری تشبیہ کے ہیں کہ ہم جب باذن الٰہی مادہ کو توڑ پھوڑ کر اس کی صنعتی ترکیب و تحلیل سے ضروریات زندگی اور اسباب معاش کا استخراج کریں گے تو اس سے قدرتی طور پر افعال خداوندی سے فی الجملہ مشابہت لازم آجائے گی یعنی مقصود اسباب معاش پیدا کرنا ہوگا نہ کہ تشبہ بالخالق پیدا کرنا تو اس سے

ہمیں انکار نہیں مگر یہ اصلاً مماثلت نہیں بلکہ انتفاع اور کسب معاش ہے جو
جائز ہی نہیں واجب ہے جس کا امر کیا گیا ہے۔ مگر وہ امر خود ان آیات تکوین
سے ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لئے جداگانہ مستقل احکام اور حدود ہیں
جنہیں شریعت نے اپنے موقعہ پر واضح فرما دیا ہے۔ ان آیات کائنات کا
حاصل اور تقاضا صرف فکر و تدبر اور مصنوع سے صانع پر استدلال کرنا
اور خالق کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ پس ہمیں اس سے انکار نہیں کہ کائناتی
مادوں سے انسان صنعت و حرفت کے ذریعہ ضروریات زندگی مہیا کرے۔
کہ یہ خود مامور بہ ہے۔ انکار اس سے ہے کہ ان آیات تکوین کا منشا صنعت و
حرفت کی ترقی یا اُن کا تجارتی کاروبار پھیلانا نہیں جس کا دعویٰ برق صاحب
کر رہے ہیں۔ ان آیات کا ماحصل تکوینی دلائل سے معرفت خالق ہے۔ چنانچہ
ان آیات میں جگہ جگہ مصنوعات الٰہیہ اور تخلیق خداوندی کے نمونے زمین،
آسمان، بجلی، ہوا، بادل، آگ، حیوان، انسان، جمادات، نباتات اور ان کے
طبعی افعال و خاصیات وغیرہ پیش کر کے ہر جگہ آخر میں صرف یہ کہنے پر قناعت
کی گئی ہے کہ ان میں اللہ کی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں پوشیدہ ہیں مگر کن
کے لئے؟ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ لِقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ لِقَوْمٍ يَّتَذَكَّرُوْنَ
لِاُولِي الْاَلْبَابِ لِاُولِي النُّهٰى یعنی ان میں نشانیاں ہیں، عقلاء کے لئے، فکر والوں
کے لئے، سمع و طاعت والوں کے لئے، بیدار مغزوں کے لئے اور خواہشمند ول

کے لیے کیونکہ ظاہر سے باطن کا پتہ لگا لینا، صورت سے ماہیت کا سراغ نکال لانا اور ہیئت سے حقیقت تک پہنچ جانا ہی عقل، تدبر، دانش، ہوشمندی فکر رسا اور بیدار مغزی کا کرشمہ ہو سکتا ہے۔ گویا مادہ کا معنوی تجزیہ کر کے اس سے علم پیدا کرنا اور وہ بھی علم حقیقت۔ اور پھر اس سے حقیقت الحقائق تک جا پہنچنا بلاشبہ اونچی عقل۔ اور اعلیٰ دانائی ہی کا کام ہے۔ یہی قدرت کی وہ بڑی نشانی ہے جس کو اہل عقل ان تکوینیات میں سے نکال لاتے ہیں۔ لیکن مادہ کی صورت توڑ پھوڑ کر چھری کانٹے بنا لینا، ریل، موٹر چلا لینا، برق و بخارسے لوہے کی کلیں ہلا دینا۔ اور مختلف قسم کی صناعیاں، بروئے کار لا کر بازاروں اور دکانوں کو تجارتی مال سے پاٹ دینا .... اور اس سے سرمایہ داریں کر اینٹھ مروڑ سے رہنا آخر کون سی ایسی بڑی نشانی تھی جو قرآن کے اترے بغیر کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی؟

قرآن جب تک نہیں اترا تھا جب بھی تو ہر قوم اپنے مناسب حال و مزاج۔ اور ضروریات وقت کے لحاظ سے ان ساری صنعتوں میں ترقی کر رہی تھی۔ عاد و ثمود کی حیرت ناک مدنیت کے کارنامے ان کے بعد کلدانیوں۔ قوم ابراہیم کی طلسماتی ترقیات، ان کے بعد رومیوں اور ایرانیوں کے اعلیٰ ترین تمدنی عجائبات نیز اور دوسری اقوام کی محیر العقول مادی صناعیاں قرآن ہی کے

بیان کے مطابق اس کے نازل ہونے سے کہیں پہلے سے موجود تھیں۔ ان کا وجود قطعاً قرآن کے نزول پر موقوف نہ تھا۔ نہیں بلکہ سرے سے نبوت پر بھی معلق نہ تھا بلکہ ایسی ترقیات زیادہ تر کی ہی ان اقوام نے ہیں جو نبوتوں سے بیزار اور آسمانی کتابوں کا مذاق اڑانے والی تھیں۔ پس یہ تمدنی صنعت گری کونسی ایسی چیز تھی کہ اگر قرآن نہ اترتا تو وہ رونما نہ ہوتی؟ کیا برق صاحب اس کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ کہ یورپ کے ترقی یافتہ یا تشدد ول نے یہ مادی ترقی قرآن پڑھ پڑھ کر کی ہے۔ اور کیا انگلستان، امریکہ، جرمنی اور جاپان وغیرہ کے مشینی کارخانے سورۂ بقرہ اور آل عمران سے مستنبط کئے گئے ہیں تا آنکہ آج کے مسلمان بھی قرآن پڑھ پڑھ کر ٹیکنیکل کارخانوں کا سنگ بنیاد رکھیں اور ان میں بڑھیں چڑھیں؟ آج ملحدانِ یورپ قرآن ہی کو نہیں، سرے سے نبوت ہی کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور اگر کوئی اپنے خیال میں کسی حد تک کسی نبی یا کتاب کو مانتا بھی ہے تو صرف ادب و اشارہ یا نظر و فکر کی حد تک۔ معاملہ کی حد تک اسے کلیتہً ٹھکرائے ہوئے ہے۔ لیکن ان کی کونسی صنعت و حرفت یا مادی ترقی اس بے عملی سے رکی ہوئی ہے کہ ان کی ترقیات کو قرآنی عمل پکارا جائے۔

پس قرآن کا بزعم برق صاحب بڑے شد و مد سے ایسے امور پر توجہ دلانا جو سرے سے اس کے وجود و نزول ہی پر موقوف نہ تھے۔ اور ایسے مبتذل علوم لاکر پیش کرنا جو پہلے سے معلوم عوام تھے۔ اور ایسی ترقی کو اپنی ترقی کہنا

جو اس کو ٹھکرا دینے والی قومیں اس کے برعکس عمل پیرا ہو کر بھی کر رہی ہیں اور کر تی آرہی ہیں کونسا ایسا عظیم کارنامہ تھا۔ کہ قرآن سر دو بجا کر کے اسے عقلاء اور مفکروں کے سامنے بطور آیات قدرت پیش کرتا؟ اس لئے ان آیات قرآنی کی پیروی کے معنی افعال خداوندی کے ساتھ کسی ارادی مماثلت یا مشابہت کے ثابت ہو ہی نہیں سکتے۔ کہ انہیں مدلولات قرآنی کہا جائے بلکہ یہ صرف تفسیر بالرائے اور ایک ذہنی اختراع ہے جسے قرآن کے سر زبردستی تھوپا جا رہا ہے

وکلٌّ یدّعی حبًّا للیلیٰ ولیلیٰ لا تقرّ لھم بذاک[1]

پس جبکہ قرآن کی اخباری آیات کی پیروی اور اس میں چھپی ہوئی نشانی سے عملی زندگی بنانے کا مطلب نہ مماثلت نکلتا ہے نہ تشبیہ بالخالق جو برق صاحب کا منصوبہ تھا۔ تو پھر وہ کون سی عظیم اور عبرت ناک چیز ہے جو ان اخباری آیتوں کے ذریعہ انسانوں تک پہنچانی مقصود ہے؟

اگر دل کی گہرائیوں سے غور کیا جائے تو وہ مقصد بجز کسی علمی اور عرفانی مقصد کے کوئی صنعتی اور تجارتی مقصد نہیں ہو سکتا۔ اور وہ علم و عرفان بھی کائناتی مخلوق یا مواد و عناصر کا نہیں کہ اس کے لئے صرف حیوانی حس کافی ہے کسی علم اعلیٰ یا عقل اعلیٰ کی ضرورت ہی نہیں بلکہ وہ علم و عرفان خالق کائنات ہی کی ذات و صفات اور حقائق الٰہیہ کا ہو سکتا ہے کہ نہ اس سے بڑھ کر کوئی علم اعلیٰ ہے نہ کوئی معرفت اونچی ہے اور بلاشبہ قرآن ہی کے لئے زیبا تھا کہ وہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اترے۔ اور پوری شدومد سے قدرت کی ہزاروں حسی اور معنوی آفاقی

---

[1] اور ہر شخص لیلیٰ کی محبت کا مدعی ہے مگر لیلیٰ اس کا اقرار نہیں کرتی۔

اور انفسی نشانیاں دکھلا کر انسانوں کو ایسے اچھوتے انداز میں یہ اعلیٰ ترین مقصد سمجھائے جس کی نظیر سابقین میں نہ ملے تاکہ اس کے علمی اعجاز اور عرفانی انداز کا آج کی متمدن اور ترقی یافتہ دنیا بھی لوہا مانے بغیر نہ رہ سکے۔ اور خدا کی حجت اس دور کے انسانوں پر تمام ہو جائے۔

پس ان تکوینی آیات سے درحقیقت نظر و فکر اور استدلال کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے تاکہ آدمی مخلوق سے خالق کی طرف اور مصنوعات سے صانع عالم کی طرف متوجہ ہو اور ساری کائنات کو آئینہ جمال حق بنا کر اس کے ذریعہ سے حق اور کمالات حق کا مشاہدہ کرے۔ اس کی عظمت اپنے دل میں بٹھلائے اور اس معرفت کو جوہر نفس اور صفت قلب و روح کر کے جب آخرت میں پہنچے تو حقائق اس کے سامنے عیاں ہوں اور حقیقت الحقائق کا عینی مشاہدہ اسے میسر آ جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان آیات قرآنی کے علوم کا عمل یہ مادی تصرفات نہیں جو غلطی سے سمجھ لیا گیا ہے۔ اور اسی لیے اس کائنات کو عملی قرآن کہہ دیا گیا۔ بلکہ ان خدائی تصرفات میں غور و فکر کے استدلال کے ساتھ معرفت خالق کا عقیدہ دل میں جمانا اور معرفت نفس کی تکمیل کر کے اس کی قوت عملیہ کو مضبوط بنانا ہے۔ تاکہ وہ اللہ کے اوامر و نواہی والی آیتوں کی تعمیل کے لیے مستعد اور ہمہ تن شوق بن کر عملی میدان میں آ جائے۔ اور اس طرح اس کی قوت عملیہ کی

تکمیل ہو جائے ۔ پس یہ آتیں درحقیقت قلب کے لئے تو اس عرفانی عمل کا تقاضا کرتی ہیں جس کا نام "عقیدہ" ہے اور قالب کے لئے اس حسی عمل کا تقاضا کرتی ہیں جس کا نام "عمل صالح" ہے اور جو قرب الٰہی کے درجات پر انسان کو چڑھاتا ہے ۔ یعنی کوئی آیت تو مصنوعات الٰہیہ پیش کر کے وجود صانع کے عقیدہ کو بدلائل دلوں میں راسخ کرنا چاہتی ہے ۔ کوئی آیت قدرت کی تکوینی نشانیاں دکھلا کر اس کی توحید کا عقیدہ دلوں میں جمانا چاہتی ہے ۔ پھر کوئی آیت اس کا کمال صناعی پیش کر کے اس کی تنزیہہ و تقدیس کا عقیدہ سامنے لاتی ہے ۔ اور کوئی آیت اتقان صنعت سامنے لا کر اس کی حمد و ثنا کا جذبہ ابھارنا چاہتی ہے پس ان آیات کا مقتضا اور تقاضا کہ وہ عمل افعال خداوندی کی مماثلت یا صنعت و حرفت اور تمدنی ایجادات کی ترقی نہیں بلکہ دینی فکر و تدبر کی ترقی ہے ۔ گویا تدبر فی الآیات سے معرفت حقائق اور عرفان الٰہی تک پہنچنا جو افعال قلوب اور مساعی روح کی ترقی ہے ۔ اور پھر ان عرفانی عقیدوں کے تقاضہ سے افعال عبودیت کی ادائیگی اور عام بدنی عبادات کا بروئے کار لایا جانا ہے ۔ جو درحقیقت ان عقائد کے آثار اور ثمرات کی ترقی ہے ۔

ہاں مگر ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیئے کہ معرفت عقائد میں استقامت اور قوت عملیہ کی راستبازی جس میں کجی اور کج فہمی کا شائبہ نہ ہو بغیر ذہن کی سلامتی اور بلا ذہنیت کی استقامت کے ناممکن ہے ۔ اور ذہنیت میں سے زیغ

اور کجی کا نکل جانا عادتاً بلا تربیت و تعلیم ناممکن ہے۔ پھر اس صحیح معرفت اور علمی قوت کی واقعی راستی کے بعد بھی عادۃً عمل کا نقشہ اس وقت تک صحیح اور انداز مطلوب پر نہیں آسکتا جب تک کہ کسی عارف کا کوئی عملی نمونہ سامنے نہ ہو تاکہ اسے دیکھ دیکھ کر اور اس پر تطبیق دے دے کر عمل و عبادت کے وہی نقشے بنتے رہیں جو مطلوب ہیں بالخصوص جبکہ یہ عمل خدا تک پہنچنے اور اس کے قرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہو تو وہ اس وقت تک کبھی بھی مطلوبہ نہج پر استوار نہیں ہو سکتا جب تک کہ عمل کا کوئی خدائی ہی نمونہ سامنے نہ ہو جس کی زبان طرز ادا لب و لہجہ اور اشارات وغیرہ سے تو ہم خدا کے قانون اور اس کی عملی مرادوں کو سمجھ سکیں۔ اور جس کے عملی نمونوں کی محسوس ہیئتوں کو ذہن میں جما کر ہم اسی انداز سے عمل پیرا ہو سکیں۔ اور اس طرح ہمارا علم تو صحیح ہو کر "علم نافع" بن جائے اور عمل مقبول ہو کر "عمل صالح" ہو جائے جو منزل مقصود تک پہنچا سکے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے قرآن اتار کر اس کے تمام علمی و عملی گوشوں کو نمایاں کرنے اور فہم و عمل کے قابل بنانے کے لئے ذات بابرکات محمدی کو حسی اور عملی نمونہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا تاکہ آپ کے خالص اور قطعی علم بالقرآن سے ہم علم سیکھیں اور آپ کے مقبول اور مصدقہ الٰہی عمل بالقرآن سے ہم عبادت و عادت اور معاشرت و سیاست وغیرہ کے عمل کی مطلوبہ صورتیں قائم کر سکیں۔ اور آپ کے تخلق باخلاق اللہ سے ہم اپنے قوائے عمل یعنی اخلاق صحیح کر لیں۔ اس لئے عملی

قرآن حقیقتاً ذاتِ محمدی ثابت ہوتی ہے جس نے قرآنی علوم کے مطابق عملی نمونے قائم کر کے دکھلائے نہ کہ یہ کائنات حسی کہ وہ اگر عمل ہے تو خدا کا ہے نہ کہ بندوں کا مطلوبہ عمل۔ اور خدا کا عمل یقیناً عبادت نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ بندوں سے عمل بالقرآن کی صورت میں عبادت مطلوب ہے جو بنص قرآن تخلیق انسانی یعنی عالم خلق کی بھی حقیقی غایت ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ	اور میں نے جن وانس کو دراصل اسی
إِلَّا لِيَعْبُدُونِ	واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں۔

اور عالم امر ونہی کی بھی واحد غرض وغایت یہی ہے کہ

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ	حالانکہ ان لوگوں کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ
مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ	کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت اسی کیلئے
وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ	خاص رکھیں۔ یکسو ہو کر نماز کی پابندی
وَذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ	رکھیں اور زکوٰۃ دیا کریں۔ یہی طریقہ ہے
(پارہ عم سورۃ بینہ)	ان درست مضامین کا۔

اور خود یہ عالم خلق یعنی کائنات اور اس کے عناصر و موالید نیز اس کے افعال وخواص سو وہ محض مثال اور دلیل کے طور پر سامنے لائی گئی ہے نہ کہ نمونہ عمل بنا کر۔ اگر یہ کائنات کا صنعتی عمل ہی قرآن کا طلب کردہ عمل ہو تو معروضہ سابق کے مطابق جبکہ اخباری آیات کے تحت ہر مخاطب پر ایک کائنات بنانا

اور انشائی آیات کے تحت ایک قرآن بنانا بمماثلت خداوندی ضروری ہوگا
تو حاصل یہ نکلے گا کہ انسان اس عالم میں بندگی کرنے نہیں آیا۔ بلکہ خدائی
کرنے کے لئے آیا ہے۔ حالانکہ اس بدیہی البطلان نظریہ کا رد قرآن کی آیات بالا
اور عقل سلیم نیز بحیثیت مجموعی پورا دین صاف طور پر کر رہا ہے جس کی مسلمان
میں کوئی کھپت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے اس کائنات کے قرآنی عمل ہونے
کا دعوے ثابت نہ ہوگا۔ بلکہ واضح ہوگا کہ قرآنی عمل جب کہ عبادت اور بندگی
ہے تو اس امت کے لئے عبد کامل۔ اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا
دوسرا نہیں بندہ ہی اس قرآنی عمل کا نمونہ ہو سکتا ہے نہ کہ جبال و بحار اور دخان
و بحار۔ پس اگر برق صاحب کی طرح تعداد قرآن کا دعویٰ ہی کچھ قرآن کی منقبت عظیمہ
ہے تو وہ یوں ہونا چاہیئے تھا کہ اس عالم موجودات میں ایک یا دو ہی قرآن
جلوہ گر نہیں ہوئے جیسا کہ برق صاحب کا دعویٰ ہے بلکہ تین قرآن لائے گئے
ہیں۔ ایک یہ کتابی قرآن جو مجموعۂ احکام ہے۔ ایک یہ کائناتی قرآن جو مجموعۂ شواہد
و دلائل ہے۔ اور ایک یہ انفسی قرآن یعنی ذات نبوی جو مجموعۂ اخلاق و اعمال ہے
پس کتاب اللہ یعنی اوراق مرقوم کو تعلیمی قرآن کہنا چاہیئے۔ اور اس خلق اللہ
یعنی کائنات کو تمثیلی قرآن کہنا چاہیئے اور رسول اللہ یعنی ذات محمدی کو تعمیلی
قرآن کہنا چاہیئے۔ پس جو کتاب اللہ سے آنکھ بند کرلے گا وہ علم و ہدایت سے
محروم رہ جائے گا۔ جو کائنات خلق میں تفکر سے آنکھ بند کرلے گا وہ شہودی

دلائل سے محروم رہ جائے گا - اور جو اسوۂ رسول ؐ سے صرف نظر کرے گا وہ عمل
بالقرآن سے محروم رہ جائے گا -

بہرحال سماوات و ارض کے عجائبات کی طرف متوجہ کرنے اور انہیں
غور و فکر کا امر کرنے کا مقصد قرآنی ہدایات کی روشنی میں معرفت خالق ،
معرفت توحید ذات و صفات اور معرفت توحید افعال سے نفس انسانی کی
تکمیل - اور اسے فضائل علم و اخلاق سے آراستہ اور مہذب بنانا ہے -
ریل و تار ، ٹیلیفون و لاسلکی ، موٹر اور جہاز وغیرہ کے کارخانے کھلوانا نہیں یعنی
موحد اور عابد بنانا ہے - انجینیر ، لوہار اور بڑھئی بنانا نہیں کہ یہ سب کچھ بننا نہ
قرآن پر موقوف ہے - نہ ختم نبوت کی لائی ہوئی معرفت و بصیرت پر -

البتہ بطور وسیلہ عبادت ان مادی اشیاء اور تمدنی صنائع سے کلیتہً
الگ کر دیا جانا بھی مقصود نہیں بلکہ بضرورت عبادت اور بضرورت نفاذ
خلافت بقدر ضرورت ان وسائل کی تحصیل بھی ضروری قرار دی گئی ہے تاکہ
معاش کی طرف سے مطمئن ہو کر ایک انسان معاد کی فکر کر سکے - اور قانون
الٰہی کو قوت سے دنیا میں پھیلانے اور رواج دینے میں اس کے لیے
کوئی مانع یا حیلہ باقی نہ رہے - بالفاظ دیگر وہ اسباب معاش سے
تو اپنے نفس کا مقابلہ کر سکے جو راہ دین میں سب سے بڑا دشمن اور مانع ہے -
اور وسائل قوت و شوکت سے فتنہ پردازوں کا مقابلہ کر سکے جو راہ شوکت

دین میں سب سے بڑے حارج اور مانع ہیں - اور اس طرح اعدائے نفسی اور اعدائے آفاقی کی دست برد سے دین اور شوکتِ دین محفوظ رہے پس یہ مادی وسائل اور تمدنی ایجادات برق و بخار، ریل و تار، گن اور بم، موٹر اور جہاز یا زمانہ کے حسب حال اور اسباب نقل و حمل اور اسباب علم و خبر جس کسی دور میں بھی چل پڑیں گے اور ان پر حیات دنیا موقوف ٹھہر جائے گی تو اسلام بھی انہیں لامحالہ اختیار کرنے سے نہیں روکے گا لیکن نہ وہ ان کی ایجاد و تخلیق کو مقصد زندگی بنائے گا - نہ اُن کی تخلیق و ایجاد میں بالاصالت وقت صرف کرنا ضروری سمجھے گا - اور چل پڑیں گے تو بطور وسیلہ انہیں قبول کرے گا - لیکن جب بھی اس کی اخلاقی قوتیں بروئے کار آجائیں گی - تو وہ ان مصنوعی قوتوں سے اس کے لئے جگہ خالی کرا لے گا -

پس اسلامی نقطۂ نظر سے نہ تو نظری طور پر ان وسائل کو مقاصد باور کرنا ہی جائز رکھا گیا ہے اور نہ عملی طور پر ان میں برنگِ مقاصد غرق اور مستہلک ہو جانا ہی روا رکھا گیا ہے -

اس نوعیت کے واضح ہو جانے کے بعد یہ جرأت نہ ہونی چاہیئے کہ مقاصد عبودیت کو چھوڑ کر صرف ان فانی وسائل میں کھپ جانے اور انہیں ہی مقصد زندگی ٹھہرا لینے کو خلافت الٰہی کہا جائے - کوئی بھی سنجیدہ عقل اسے تسلیم نہیں کر سکتی کہ جس خلافت الٰہی کے برپا کرنے کے لیئے

ہزار ہا انبیاء مبعوث ہوئے۔ لاکھوں حواری اور صحابۂ انبیاء برپا کئے گئے اور کروڑوں نائبان انبیاء اور صلحاء ظاہر ہوئے۔ اس خلافت کے معنے لوہے، پیتل، لکڑی اور پتھر وغیرہ کے مختلف معاشی سامان ڈھالنے اور ان سامانوں سے اسباب عیش و نشاط یا اسباب تباہی و ہلاک افراط کے ساتھ مہیا کرکے دنیا میں فساد مچانے کے ہیں۔ اگر یہی خلافت الٰہی تھی تو ایک طرف تو معاذ اللہ فرعون مصر، کسرائے فارس، قیصر روم، خاقان چین، راجائے ہند نیز دوسرے اور بڑے بڑے عیش پسند یا جنگ جو سرمایہ دار بلکہ تمام دشمنان انبیاء جیسے قارون اور ہامان، نمرود اور شداد، ابوجہل اور ابولہب وغیرہ سب سے بڑے خلفائے الٰہی ثابت ہوتے ہیں۔ اور یا پھر بڑے بڑے صناع لوہار، بڑھئی، صراف اور سنار وغیرہ خلفائے الٰہی ثابت ہوں گے۔ اور جبکہ ان فنون اور فن کاروں کے وجود کے لئے قرآن اور نبوت ہی کی ضرورت نہ تھی تو دوسرے لفظوں میں اس خلافت کے لئے بھی نہ نبوت کی ضرورت رہتی ہے نہ قرآن کی۔ بلکہ اس خلافت کے حق میں نبوت خارج نکلتی ہے۔ اس لئے کوئی نبی بھی اس بنائی اصول پر خلیفۂ الٰہی باقی نہیں رہ سکتا۔ بلکہ کوئی بھی ایسا شخص جو ان مادیات کے عشق سے کٹ کر یاد خداوندی میں راسخ القدم ہو دنیا پر آخرت کو ترجیح دیتا ہو یا آخرت کے راستہ سے دنیا پر قابو پانے کا جذبہ و عمل رکھتا ہو، خلافت کی فہرست میں شامل نہیں رہ سکتا۔

حالانکہ اس نظریہ کے محال شرعی ہونے میں کسی پلید سے پلید انسان کو بھی تامّل نہیں ہو سکتا۔

مگر یہ شرعی استحالہ محض اس لئے لازم آیا کہ خلافت کے معنیٰ الٹ دیئے گئے۔ اور اس کے عنوان کو باقی رکھ کر اس کے حقیقی مفہوم میں معنوی تحریف کر دی گئی جس سے خلافت کا لفظ باقی رہ گیا اور حقیقت گم ہو گئی اس تلبیس کی انتاجی شکل بہ ڈن صاحب کے نظریہ پر اب یوں ہو جاتی ہے کہ خلافت کی حقیقت ایمانداری ہے اور ایمانداری کی حقیقت یہ دنیا داری ہے۔ اور دنیا داری کی حقیقت یہ لوہاری اور بڑھئی گری ہے اور یہ لوہاری اور نجاری کی حقیقت دکانداری ہے۔ اور اس دکانداری کی حقیقت عیاشی اور ظلم کی گرم بازاری ہے۔ لہذا خلافت کے معنے عیاشی اور ظلم و ستم کے نکل آئے۔ اور یہ خلافت جبکہ خدا کی ہے اور یہ انسان اسی کا خلیفہ اور نائب بن کر آیا ہے تو معاذ اللہ یہ عیاشی اور ستم رانی آخر میں خدا کا وصف خاص ثابت ہوتی جاتی ہے۔ فَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ کَبُرَتْ کَلِمَۃً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا کَذِبًا۔

پس کہاں خلافت کے معنیٰ تکمیل انسانیت کے تھے۔ اور کہاں اب تخریب انسانیت کے نکلے۔ یہ سب اسی بد ذوقی اور زیغ کا نتیجہ ہے۔ جو تزکیہ سے الگ رہ کر محض الفاظ قرآن سے اس کے معنیٰ ناہموار نفس سے

اختراع کر لئے گئے انہی کو مرادِ ربانی سمجھ لیا گیا۔ اور دین کو نقلی رکھنے کے بجائے اختراعی قرار دے لیا گیا تاکہ اس کی تعبیرات کو باقی رکھ کر از راہِ تلبیس اس کے معانی میں من مانے تصرفات کے راستے کھلے رہیں۔ اور اس طرح مسلمانوں کو الفاظ قرآنی سُنا کر بآسانی جال میں پھانسا جا سکے۔

بہر حال جس خلافتِ الٰہی کے لفظ کو ہاتھ میں لے کر یہ تجارتی، صنعتی اور تمدنی ترقی اس کے مفہوم میں شامل کی گئی بلکہ انتہاءً اسی کو اس کا صحیح مفہوم قرار دیدیا گیا۔ اس کی حقیقت اچھی طرح واضح کر دی گئی۔ تاہم پھر بھی اس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ بحث و تنقید سے الگ ہو کر تحقیق کی نگاہ سے بھی اس مسئلہ کو دیکھا جائے اور یہ بتلایا جائے کہ اگر خلافت اور امانداری کے وہ معنی نہیں اور یقیناً نہیں جن کو برق صاحب نے اختیار کیا ہے تو اس کے اصلی معنی کیا ہیں؟ اور اگر یہ تمدنی ایجادات اور مادہ کو توڑ پھوڑ کر مختلف اشیاء بنانا یا عناصر کائنات کو مسخر کرنا یا ہواؤں میں اڑنا اور ایجاد و اختراع سے مادی دنیا کو قابو میں لے آنا خلافت الٰہی نہیں تو کیا پھر خلافت کے معنے بقول برق صاحب کے اسی کوری ملائیت" کے نہیں رہ جاتے جس کے نیچے بقول موصوف منشاً قدرت سے ناواقفی، انفسی اور آفاقی وسائل سے بے خبری اور انجام کار بے بسی اور بے حسی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے؟ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ خلافت الٰہی کی نوعیت پر ایسے انداز سے روشنی ڈالی جائے کہ جس کے

اُجالے میں تسخیر کائنات کی وہ نوعیت بھی واضح ہو جائے جو قرآن نے انسان سے طلب کی ہے - اور جو خلافت کا حقیقی مفہوم ہے - نیز عبادت و بندگی یا دیانت کے فرائض کا رشتہ بھی اس تسخیر عالم سے واضح ہو جائے جو اساس خلافت کی حیثیت رکھتا ہے اور ساتھ ہی جن تین قرآنوں کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے ان کی عرض کردہ موضوع - اور مقصد کی نوعیت بھی تحقیقی رنگ میں کھل جائے -

قرآن کا مقصد وحید تکمیل خلافت ہے

سو حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم کا مقصد وحید انسان کو اس کی حد کمال پر پہنچا کر اس کی انسانیت کی تکمیل کرنا ہے اور جبکہ کمال کا حقیقی سرچشمہ ذات خداوندی کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا جس کے اوصاف و افعال سے اسی کے فرمان کے مطابق مشابہت پیدا کر کے ان کمالات کو بقدر استعداد و قابلیت جوہر نفس بنا لینا ہی انسانیت کی تکمیل ہے اور اس تشبہ یا استکمال ہی سے خدا کی نیابت و خلافت کا استحقاق خصوصی طور پر انسان کے لیے ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے تکمیل انسانیت کا دوسرا نام تکمیل خلافت نکل آتا ہے۔ اور قرآن حکیم کا حقیقی مقصد انسان کو خلیفۂ ربانی کر دکھانا ٹھہر جاتا ہے۔

معیارِ خلافت و استخلاف

ظاہر ہے کہ کوئی بھی کسی کا خلیفہ یا نائب اور قائم مقام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ منیب اور اصل کے اوصاف کو اپنے اندر سمو نہ لے۔ اور ان سے متاثر ہو کر اصل کا نمونہ نہ بن جائے۔ ایک عالم کا خلیفہ عالم ہی ہو سکتا ہے۔ نہ کہ جاہل۔ ایک عارف باللہ اور روشن ضمیر درویش کا خلیفہ عارف ہی ہو سکتا ہے۔ نہ کہ تنگ سینہ اور رکو رباطن۔ ایک با اقتدار بادشاہ کا قائم مقام با اقتدار ہی بن سکتا ہے نہ کہ گدائے بے نوا، اور عاجز و درماندہ۔ ایک پہلوان کا خلیفہ پہلوان ہی ہو گا۔ نہ کہ پہلوانی کے داؤ پیچ سے نابلد، ایک شاعر کا قائم مقام شاعر ہی ہو سکتا ہے۔ نہ کہ فنِ شاعری سے ناواقف اور کج مج زبان۔ اس لئے خدائے برتر و توانا کا خلیفہ وہی ہو سکتا ہے جو خدائی اوصاف و کمالات کے پرتو اپنے اندر لئے ہوئے ہو۔ ان سے متاثر ہو، اُن کا سچا نمونہ بن کر پردۂ دنیا پر نمودار ہو۔ اور پوری پوری طرح اس کا اطاعت شعار ہو کر اس کی مرضیات پر عمل پیرا ہو۔ نہ وہ کہ جو اس کے اوصاف و کمالات سے قطعاً ناآشنا یا ان کی نسبت سے نااہل اور یا ان اوصاف و افعال کی مخالف سمت میں جا رہا ہو۔ اور اسے اطاعت و انقیاد سے کوئی واسطہ نہ ہو بلکہ ہر آن بغاوت پر تلا ہوا ہو۔

کمالاتِ خداوندی کی نوعیں

ہاں مگر اللہ جل ذکرہٗ کے وہ لامحدود کمالات جن کے اقتباس سے آدمی خلیفۂ الٰہی قرار پاتا ہے۔ اصولی نقطۂ نظر سے تین نوعوں میں منحصر نظر آتے ہیں۔ کمالات علم وادراک۔ کمالات وصف و اخلاق اور کمالات صنعت و افعال۔ چنانچہ کتاب وسنت میں جس قدر بھی اسماء وصفات اسم یا فعل کی صورت میں ذکر فرمائے گئے ہیں وہ سب انہی تین انواع کمالات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یا وہ علمی اسماء ہیں۔ جن سے اللہ کے علمی کمالات پر روشنی پڑتی ہے۔ جیسے علیم وخبیر۔ سمیع و بصیر، مدرک وواجد۔ وغیرہ یا وہ اخلاقی اسماء ہیں جن سے اس کے جوہری اخلاق اور پاکیزہ و لطیف تقاضائے باطن پر روشنی پڑتی ہے جیسے صبور وشکور، رؤف و غفور، رحیم وکریم۔ عفو وحلیم اور قوی و متین وغیرہ یا افعالی اور صناعی اسماء ہیں جن سے اس کے صنعتی کمالات پر روشنی پڑتی ہے جیسے خالق و باری۔ بدیع و مصور۔ مبدی ومعید۔ محی ومميت، نافع وضار۔ اور رازق ومعطی وغیرہ۔ بقیہ اسماء سب کے سب یا انہی تین کے متعلقات۔ اور مبادی وآثار میں سے ہیں یا نفس ذات کے پردہ دار ہیں۔

قرآن کریم نے اصولی اور کلی طور پر ان تینوں کمالات کا حقیقی سرچشمہ حق

تعالیٰ کو بتلاتے ہوئے سارے جہانوں پر اس کے انہی تین کمالات کا احاطۂ عام ثابت فرمایا ہے۔ کمالات علم و ادراک کے احاطۂ عام کے بارہ میں ارشاد ہے۔

وَاِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْماً — اور بیشک خدا تعالیٰ از روئے علم کے ہر شئی کو محیط ہے۔

کمالات و صفت اخلاق کی اصل صفت رحمت جو جمالی اخلاق کا سرچشمہ اور جلالی اخلاق کا منشا ہے۔ اور جس کی ہمہ گیری گویا تمام اخلاق کمال کی ہمہ گیری ہے اس کے احاطۂ عام کے بارہ میں فرمایا۔

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ — اور میری رحمت تمام چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے۔

کمالات صنعت و افعال کے احاطۂ عام کے بارہ میں فرمایا۔

صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ — یہ خدا کا کام ہوگا جس نے ہر چیز کو دمناانداز پر) مضبوط بنا رکھا ہے۔

غرض کمالات ربانی کی بھی تین اصولی انواع ہیں جو تمام برکات و خیرات کا سرچشمہ ہیں اس لئے قدرتی بات ہے کہ انسان اللہ کا نائب یا خلیفہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان سہ گانہ کمالات بس اسی کے طرز کمال کا نمونہ بن کر نہ دکھلائے! ور ان کمالات علم و ادراک، کمالات وصف و اخلاق اور کمالات صنع و افعال کی روشنی اپنے اندر جذب کر کے اسی انداز سے نہ پھیلائے جو اندازِ افادہ خود اس خداوند ذوالجلال والاکرام کا ہے۔

بعثتِ انبیاء کا مقصد انہی کمالاتِ سہ گانہ کی ترویج و تکمیل ہے

چونکہ انبیاء علیہم السلام اولین خلفائے الٰہی ہیں۔ اس لئے ان کی بعثت کی غرض و غایت ان ہی تین کمالات علم و خلق و صنع سے بنی آدم کو آشنا بنانا اور عملی طور پر اس راہ چلانا ہے تاکہ انسان خلیفۂ الٰہی بن کر اپنے منیب کے منشا کے مطابق انہی تینوں کمالات کی روشنی میں اس کائنات کا انتظام کرے اور مالک کائنات کی مرضی پر خود چل کر اس کی رعایا کو چلائے۔

اسی لئے سرور انبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کی غرض و غایت انہی تین کمالات کی ترویج و اشاعت ظاہر فرمائی۔ چنانچہ علمی کمالات کی ترویج کا غرض بعثت ہونا تو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا کہ

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا — بس بھیجا گیا ہوں معلم بنا کر۔

اخلاقی کمالات کی ترویج کا غرض بعثت ہونا ان الفاظ میں ظاہر فرمایا

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ — میں بھیجا ہی اس لئے گیا ہوں کہ اعلیٰ ترین اخلاق کی تکمیل کردوں

علمی اور صنعتی کمالات کے غرضِ بعثت ہونے کے اعلان کے لئے شریعت غرا کی ترویج کو غرضِ بعثت ظاہر فرمایا (جو ہر نوع کی حکمت عملی یعنی تہذیبی، منزلی، مدنی عمرانی۔ تمدنی، اقتصادی، سیاسی اور صنعتی وغیرہ افعال کے فطری اصول پر مشتمل ہے) اور جس کے مجموعہ کا نام شریعت ہے۔ فرمایا

بُعِثْتُ بِالْحَنِيفِيَّةِ السَّهْلَةِ السَّمْحَةِ الْبَيْضَاءِ — میں بھیجا گیا ہوں سیدھی، سہل، روشن اور رعایتوں پر مشتمل شریعت دے کر

قرآن حکیم نے ان تینوں مقاصدِ بعثت کو ایک مختصر آیت میں اعجازی جامعیت کے ساتھ جمع فرما کر اعلان فرما دیا کہ

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ — وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں اُن ہی (کی قوم) میں سے (یعنی عرب ہی میں سے) ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔ اور ان کو (عقائد باطلہ و اخلاق ذمیمہ سے) پاک کرتے ہیں۔ اور ان کو کتاب اور دانش مندی کی باتیں سکھلاتے ہیں۔

اس آیت میں بعثت کی ایک غرض تلاوت و تعلیم آیات بتلائی گئی جو کمالات علم کی تکمیل ہے۔ بعثت کی دوسری غرض تزکیۂ نفوس ظاہر فرمائی گئی جو کمالاتِ اخلاق کی تکمیل ہے۔ بعثت کی تیسری غرض تعلیم حکمت فرمائی گئی جو اسوۂ حسنہ

یعنی حکمتِ عملی کے ذریعہ کمالات عمل کی تکمیل ہے (کیونکہ حکمت کے معنی بحسب تفسیر عیسیٰ علیہ السلام علم نافع اور عمل صالح کے ہیں جیسا کہ ابنِ تیمیہ نے نقل کیا ہے - اور علم نافع جبکہ تلاوت آیات میں آگیا تو آگے عمل صالح ہی حکمت کے مفہوم میں باقی رہ جاتا ہے - چنانچہ بعض مفسرین نے حکمت کی تفسیر عملی تکمیل ہی سے کی ہے) پس یہ آیت اس طرح تین حکمتوں حکمت عملی، حکمت علمی، حکمت اخلاقی پر مشتمل نکلی جس سے واضح ہو گیا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام انبیاء کے دنیا میں بھیجے جانے کی غرض و غایت انہی تین حکمتوں اور کمالوں کی علمی تشریح، اخلاقی تتمیم اور عملی تکمیل ہے جو اساس خلافت ہیں -

کمالات سہ گانہ کی نوعیت

ہاں پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ بسلسلۂ منصب خلافت ان ہر سہ کمالات میں
تشبہ بالخالق کی منزلیں طے کرنے کے لئے ان کمالات الٰہیہ کی وہی نوعیت اختیار
کرنی پڑے گی جو خود اس سرچشمۂ کمالات کے یہاں ان کی فطری نوعیت ہے تاکہ
اسی نوعیت کا علم و خلق اور صنع و عمل بہم پہنچ کر حقیقی معنے میں خلافت کا ثبوت فراہم
ہو جائے - اور اس کی ضرورت نہ پڑے کہ خلافت کا شرعی لفظ اختیار کر کے اس
میں معنے اپنی طرف سے ڈالے جائیں - اور حقیقی کے بجائے مصنوعی خلافت رہ جائے
جس کی حقیقت تلبیس کے سوا کچھ نہ ہو - اور ظاہر ہے کہ ان ہر سہ کمالات الٰہیہ کی
وہ اولین اصولی نوعیت جو ان میں بطور قدر مشترک کے یکساں طور پر پائی جاتی ہے -
"غناء کامل" ہے جس میں محتاجگیٔ غیر کا ادنیٰ شائبہ تک نہیں -

چنانچہ علم الٰہی کی پہلی اور آخری شان یہ ہے کہ وہ وسائل اور وسائط کا محتاج
نہیں - وہ کسبی نہیں خود اپنا ہے - وہ استدلالی نہیں ذاتی ہے کہ ماضی و مستقبل
اور شاہد و غائب سب اس کے سامنے بطور علم ضروری بکلے خود بخود حاضر
ہیں اسے حصول علم کے لئے استدلال کی حاجت نہیں کہ وہ قیاسات سے
معلومات کے اندازے لگائے - کہ یہ جہل کی علامت ہے اور وہ جہل سے بری

بالا ہے۔ اسے ظن وتخمین سے نتائج تک پہنچنے کی ضرورت نہیں کہ یہ لاعلمی کا عیب ہے۔ اور وہ ہر عیب سے منزہ اور مقدس ہے۔ اسے کتابوں سے پڑھ کر اور استادوں سے سیکھ کر معلومات حاصل کرنے کی حاجت نہیں کہ یہ ذات کا کمالات سے خلو اور استکمال بالغیر ہے جو سراسر محتاجگئ غیر ہے۔ اور وہ خلو اور احتیاج سے بری ہے۔ اسے حقائق تک پہنچنے کے لئے صورتوں شکلوں اور محسوس ہیئتوں کی حاجت نہیں کہ یہ علم بالواسطہ ہے۔ اور وہ وسائط کی محتاجگی سے بری ہے غرض علم کے دائرہ میں پہلی چیز وہاں اسباب علم سے غنار مطلق ہے۔ اسی لئے علم کے مبادی ہوں یا نتائج ہئیت ہو یا حقیقت صورت ہو یا ماہیت سب وہاں بیک دم حاضر ہیں۔ نہ ان کے اوّل میں غیر کی محتاجگی ہے۔ نہ آخر میں، نہ ظاہر میں نہ باطن میں کہ وہ خود ہی ہر چیز کا اول ہے۔ اور خود ہی آخر، خود ہی ظاہر ہے اور خود ہی باطن۔ هُوَ الْاَوَّلُ لَيْسَ قَبْلَهٗ شَيْءٌ وَهُوَ الْاٰخِرُ لَيْسَ بَعْدَهٗ شَيْءٌ وَهُوَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَهٗ شَيْءٌ وَهُوَ الْبَاطِنُ لَيْسَ دُوْنَهٗ شَيْءٌ۔

اس لئے علم الٰہی کی اساس غنار مطلق ٹھہر جاتی ہے۔

نظر بریں علم کے دائرہ میں اللہ کے حقیقی خلفار وہی ہو سکتے ہیں جن کے علم کی شان یہ غنار کامل ہو کہ وہ یا تو بلا کسب و اکتساب اور بلا واسطہ کتاب و استاد نیز بلا ریاضت و مجاہدہ وہبی اور الہامی طور پر براہ راست اللہ سے اس کا علم پائیں جس کا نام "علم لدنی" ہے جو انبیار علیہم السلام کی شان ہے۔ اور یا پھر

کسب و ریاضت بھی اگر ہو تو انبیاء ہی کے تعلیم کردہ اصول و طرق اور انہی کے پیش کردہ اسوہ کے مطابق ہو جن پر چل کر یہ علم گو آغاز کار میں کبھی اور اصولی کہلائے مگر آخر کار علم الٰہی سے ایک نسبت پیدا کر کے وہبی بن جائے اور خود قلب صافی ہی میں سے علم کا چشمہ پھوٹ نکلے جس میں وہی شان غناء آ جائے کہ نہ اس میں رسمی وسائط کی احتیاج باقی رہے نہ کتاب و استاد اور دوسرے وسائل تعلیم کی حاجت رہے جو اولیائے امت ائمہ ملت اور صلحائے قوم کی شان ہے ؎

بینی اندر خود علوم انبیا
بے کتاب و بے معید و اوستا

ہاں پھر علم ہی کی طرح یہی صورت اخلاق ربانی کی بھی ہے کہ ان کا منتہا بھی درحقیقت یہی غناء کامل ہے جو اس اخلاقی خلافت کی اساس ہے۔ یعنی ہر خلق حسن کی روح آخر میں یہی غناء اور عدم احتیاج نکلتی ہے جیسا کہ ہر بد خلقی کی روح انجام کار محتاجگی اور غیر کی غلامی اور اسیری نکلتی ہے مثلاً تواضع للہ کے معنٰی ہی یہ ہیں کہ ہم رسمی جاہ اور خودی سے کنارہ کش اور بے نیاز ہیں۔ سخاوت و قناعت کے معنٰی ہی یہ ہیں کہ ہم مال و منال کی محبت و طلب سے آزاد اور بے پرواہ ہیں۔ صبر کے معنٰی ہی یہ ہیں کہ ہمیں فوت شدہ کا غم نہیں یعنی ہمیں اس کی احتیاج نہیں۔ شکر کے معنٰی ہی یہ ہیں کہ ہم اس نعمت سے

اٹکے ہوئے نہیں بلکہ منعم سے وابستہ ہیں جو سرچشمۂ غنا ہے شجاعت کے
معنیٰ ہی جان سے بے نیازی اور استغنا کے ہیں۔ حیا کے معنیٰ ہی حق کی خاطر
مرغوبات نفس سے بے پرواہ ہو جانے کے ہیں۔ ایثار کے معنیٰ ہی دوسرے
کے نفع کی خاطر اپنے منافع سے دست بردار اور بے نیاز ہو جانے کے ہیں۔
حلم کے معنیٰ ہی انتقام سے بے نیازی اور جذباتِ انتقام سے بالاتر ہو جانے
کے ہیں۔ عفو و درگزر کے معنیٰ ہی حق کی خاطر سزا و تعزیر سے بے نیازی برتنے کے
ہیں۔ غرض ہر خلق حسن کی روح آخر میں غنا اور غیر محتاجگی نکلتی ہے۔ کہیں اپنے سے
کہیں دوسرے سے۔ کہیں اپنے حقوق سے کہیں دوسرے کے حقوق پر دست درازی
سے۔ اور اس کے بالمقابل اخلاقِ حسنہ کی اضداد یعنی ہر بد خلقی کی بنیاد جبلی
طور پر محتاجگی اور غیر کی اسیری نکلتی ہے۔ مثلاً تواضع کے مقابلہ میں تعلّی
کے معنیٰ غیر پر اپنا تفوق جتانے کے ہیں جو سراسر غیر کی محتاجگی ہے۔ کیونکہ
غیر نہ ہو تو تفوق کس پر جتایا جائے؟ لہٰذا غیر کی محتاجگی ہوئی پھر وہ ہمیں اپنے
سے فائق خیال نہ کرے تو یہ تعلّی کامیاب کیسے ہو؟ لہٰذا غیر کے خیال تک کی
محتاجگی ہوئی۔ اس لئے تعلّی اور شیخی سر تاپا احتیاجِ غیر نکلتی ہے جو ہمیں دوسرے
کا اسیر اور قیدی بنا دیتی ہے جسے ہم غلط فہمی سے عزت تصور کرنے لگتے
ہیں۔ حالانکہ وہ انتہائی ذلت اور ذلتوں کی جڑ بنیاد ہے۔ یا مثلاً سخاوت
کے مقابلہ میں بخل کے معنیٰ مالی محتاجگی کے ہیں نہ کہ اس سے غنی اور آزاد ہو جانے

ہے۔ بے صبری اور جزع فزع کے معنیٰ فوت شدہ سے اٹکاؤ اور اس کے غم میں گھل جانے کے ہیں کہ اس کے بغیر چین و قرار نہیں۔ اگر اس سے غنی ہوتے تو یہ بے چینی کیوں ہوتی۔ یہی اس کی محتاجگی اور غلامی ہے۔ جبن و بزدلی کے معنیٰ مقابل کی صورت سے متاثر ہو کر اس کی طاقت سے دب جانے کے ہیں اور تاثر ہی محتاجگی ہے۔ ناشکری اور کفرانِ نعمت کے معنیٰ سرچشمۂ نعمت یعنی منعم سے کٹ کر خود اپنے بے نعمت نفس کی اسیری اور غلامی کے ہیں جو خود بذاتہ اس نعمت سے محروم تھا ورنہ دوسرے سے نعمت کا خواہاں اور حاصل کنندہ کیوں ہوتا اور محرومی و مفلسی یا عطارِ غیر کی احتیاج ہی غیر کی اسیری ہے جو سرتاسر ذلت نفس ہے۔ حرص کے معنیٰ دولت اور اسباب شہوت کی محتاجگی کے ہیں۔ بے حیائی اور فحش کے معنیٰ عقل و شرع سے الگ ہو کر خواہش نفس کی پیروی کے ہیں۔ جو بالطبع جاہل اور بے تمیز ہے گویا سرچشمۂ جہالت کی محتاجگی اور اسیری کے ہیں جو ذلیل قسم کی ذلت ہے۔ غرض ہر بد خلقی محتاجگی غیر اور ذلت کی جڑ ہے۔ اور ہر نیک خلقی غنار نفس، عزت و خودی اور وقار و خودداری کی اساس ہے۔ ظاہر ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات با برکات تمام اخلاق حسنہ کا سرچشمہ اور معدن ہے تو غنار مطلق اور صمدیت کا سرچشمہ بھی وہی ہو سکتا ہے۔ اور اس کا یہ غنار بھی اس کی ذات لامحدود کی طرح لا محدود ہی ہوگا۔ یعنی یہ بے نیازی سارے جہانوں اور جہانوں

کی ایک ایک چیز سے ہو گی کائنات اور کائنات کے سارے وسائل سے
ہو گی اسی لیے اس نے اپنی شان خود ہی ارشاد فرمائی ہے

وَاِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ط   اور بلاشبہ اللہ سارے جہانوں سے
بے پرواہ ہے -

یعنی وہ کسی چیز سے اٹکا ہوا نہیں - اسی لئے اس کی عزت اور اس کا اقتدار
بھی جہانوں کے ذرہ ذرہ پر چھایا ہوا ہے اور اسی لئے اس نے اپنا
نام صمد بتایا ہے جس کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور سب
اس کے محتاج ہیں - اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب یہ سمجھ لینا کچھ مشکل
نہیں کہ اخلاق کے سلسلہ میں اللہ کا نائب اور خلیفہ وہی ہو سکتا ہے - جو
ان اخلاق الٰہیہ صبر، شکر، جود و کرم، رأفت و رحمت - محبت حق - قوت
متانت وغیرہ سے متخلق ہو کر سارے جہانوں اور جہانوں کی ایک ایک
چیز سے بے نیاز اور غنی بن جائے - اور بالفاظ مختصر اپنے خالق کے غنار
کامل کا مظہر اتم بن کر اسے اللہ کے سوا کسی غیر اللہ کی احتیاج باقی نہ رہے -
بے نیازی، بے لوثی اور استغنار کلی اس کے چہرے مہرے اس کی ہر حرکت و
سکون، اور اس کے اقوال و افعال سے نمایاں ہو - اور اس غنار کامل سے
اس کا باطن اور اندرون مگن، مطمئن، منشرح اور آسودہ ہو کر ہر غیر سے آزاد
ہو جائے - نہ اس کی عزت و جاہ کسی کے خیال پر موقوف ہو نہ اس کا حزن و غضب

کسی غیر کی عنایت پر معلق ہو نہ اس کے بسط و انبساط اور فرح و سرور وغیرہ کسی غیر سے اٹکے ہوئے ہوں جن کے زوال کا خطرہ اسے فکرمند بنا کر اس غیر کا اسیر بنا دے ۔ خلاصہ یہ ہے کہ اخلاقی خلافت بھی آخر کار اسی غنار نفس پر قائم نکلی جیسے پر علمی خلافت کی تعمیر کھڑی ہوئی تھی ۔ اور ظاہر ہے کہ جب انسان ان عنصری سامان اور مادی حوائج سے قلبًا مستغنی ہوئے بغیر خداوندی اخلاق کے غنا کا ابتدائی نمونہ بھی قائم نہیں کر سکتا جو اخلاقی خلافت کے لئے خشت اول ہے تو نا ممکن ہے کہ وہ خدائے برتر کی اخلاقی خلافت کا مستحق ٹھہر جائے اور اس میں ان اخلاق ربانی کے نور سے ۔ ۔۔۔۔ ہر غیر اللہ سے قلبی استغنار کا ظہور نہ ہو اور وہ اخلاقی طور پر محتاجگی غیر کی ان دلدلوں سے باہر نہ نکل آئے جن کی ابھی ضروری تفصیلات عرض کی گئیں ۔ اب خواہ یہ غیر اللہ جبال و بحار ہوں یا برق و بخار، آب و آتش ہوں یا خاک و باد ۔ پھر ان کے موالید ثلاثہ جمادات ۔ نباتات ۔ حیوانات ہوں یا اجناس خمسہ، پس کہاں ان مادیات کی غلامی و اسیری میں بند رہ کر اس غلامی پر فخر کرنے والے اور کہاں خلافت الٰہی جس کے معنی ہی ان اشیاء سے آزادی، غیر محتاجگی اور غلامی شکنی کے ہیں ۔ شتان بین مشرق و مغرب ۔

ہاں پھر اسی طرح جو نوعیت علم و اخلاق الٰہی اور ان کی خلافت کی ہے وہی بعینہٖ خدائی صنعت و ایجاد اور فعالی کی بھی ہے کہ اس کی اساس بھی یہی

غنار کامل اور غیر محتاجگی غیر ہے۔ یعنی اللہ کا کوئی فعل اور اس کی کوئی صنعت نہ وسائل کی محتاج ہے نہ اسباب کے تابع ہے وہ خود ہی مسبب الاسباب ہے۔ اور خود ہی متول الوسائل ہے۔ تمام افعال کو اسی کی باطنی قوت نمایاں کرتی ہے جس میں نہ مادہ درکار ہوتا ہے نہ مدت۔ خود اسی کی باطنی طاقت ایک فعل کو ذہنی وجود دے کر اسے بیک دم خارج میں نمایاں کرتی ہے جس کے لیے یہ اسباب و مسببات کا سلسلہ ضروری نہیں بلکہ صرف کن فیکون کی لامحدود طاقت سے یہ افعال بروئے کار آتے ہیں۔ اور اگر اس ظاہری عالم میں اس کے افعال بذیل اسباب بھی نمایاں ہوتے ہیں تو خود اسباب کا وجود بھی فوری اور اور آنی طور پر اسی کن فیکون کی قوت سے نمایاں ہوتا رہتا ہے۔ غرض افعال خداوندی میں اسباب و مسببات کا سلسلہ یا مادہ و مدت کا علاقہ یا زمان و مکان کا رابطہ کسی محتاجگی کے سبب سے نہیں بلکہ حکمت کے ماتحت ہے جو مخلوق کے ضعیف نفوس کی تسلی اور سہولت کے لئے قائم کیا گیا ہے۔
اور اسی کی تخلیق و ایجاد سے ہے ورنہ قدرت مطلقہ کو ان سلسلوں کی قطعاً حاجت نہیں۔ اسی لئے خوارق عادت یعنی معجزات یا کرامات یا ارہاصات یا وقتی غیر معمولی حوادث کا باب قائم کر کے اور ہر کلیہ میں مستثنیات رکھ کر نیز ہر دائرہ میں اختلاف و تضاد ڈال کر قدرت مطلقہ اور غیر محتاجگی وسائل کا کھلا عملی اعلان بھی فرما دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب صنائع خداوندی کی اصل شان وسائل سے غنا ہے اور اختیار وسائل محض حکمت ومصلحت کے لئے ہے اور وہ بھی ایجاد وسائل کے ساتھ نہ کہ محض استعمال وسائل کے ساتھ تو انسان کو بھی حقیقی طور پر صنعتی خلافت اس وقت تک میسر نہیں آسکتی جب تک کہ اس کے بھی صنع وعمل کی قوتیں اسباب ومسببات اور زمان ومکان کے سلسلوں سے بے نیاز ہوکر اسی کن فیکونی کے انداز کی نہ ہوجائیں جیسی خود اُس صانع عالم کی ہیں نیز حقیقی معنیٰ میں انسان اس وقت تک نائب صنعت و فعالی قرار نہیں پا سکتا جب تک کہ ان وسائل ظاہری سے اسے ایسا غنا میسر نہ آجائے کہ مادہ و مدت اس کے کاموں میں کوئی توقف پیدا نہ کرسکیں اور وہ اپنے صنع وعمل میں کسی غیر اللہ کا محتاج نہ رہے خواہ یہ غیر وہ بے شعور وسائل ہوں یا باشعور اشخاص واعیان، عناصر وموالید ہوں یا فلکیات و ارضیات یہ تمام اشیاء نہ اس کی صنعت میں حارج ہوسکیں نہ اس کی کسی صنعت کا موقوف علیہ بن سکیں۔ وہ چاہے تو بلا وسائل پرواز محض خدا کی طاقت کے بھروسہ اور اپنی قوت یقین سے آسمانوں تک پرواز کرسکے۔ وہ چاہے تو بلا وسائل رصدگاہ اپنے اثرات فلکیات تک پہنچا دے وہ چاہے تو بلا وسایہ لاسلکی اپنی صدا مشرق سے مغرب تک پہنچا دے۔ وہ چاہے تو فرش زمین پر بیٹھ کر فرش ہی کی نہیں عرش کی خبریں لے آئے وغیرہ۔ غرض اس کی بہر

صنعت و کارکردگی خود اسی کی قوت متخیلہ اور قوت دھیان و تصور کے تابع ہوجائے کہ جو دھیان باندھ لے وہ واقعہ بن کر سامنے آجائے۔ گویا یہ خارجی عالم اس کا ایک خیال بن جائے کہ اس کی خیالی جنبش اجزائے عالم کو جنبش میں لے آئے۔ یعنی وہ اپنے کام میں باہر کا تابع نہ رہے بلکہ ہر بیرون اُس کے اندرون کا تابع ہوجائے جس کا حاصل وہی کمال غنا نکلتا ہے جس سے نفس ہی اپنی معنوی قوت سے بڑے بڑے افعال بروئے کار لا سکے جن میں کسی مادی وسیلہ کی محتاجگی نہ رہے۔ یہ جدا بات ہے کہ ایسا قوی المعنویت بندہ اپنی شان عبدیت نمایاں رکھنے کے لئے اس غنا کا مظاہرہ نہ کرے۔ اور پیش حق باذن حق اپنی شان ادب قائم رکھنے کے لئے عوام کی طرح اسباب و وسائل کا پابند بنا رہے۔ اور جب بھی اس قوت کو کام میں لائے تو بایمار حق استعمال کرے تاکہ اس غنا کے ساتھ بھی اللہ کے سامنے اس کی محتاجگی اور بندگی غیر مشتبہ طور پر پیش ہوتی رہے لیکن ظاہر ہے کہ مستغنی خلافت کا یہ اعلیٰ ترین مقام کہ صنعت و کسب میں اعتقاداً اور عملاً اسباب و وسائل کی حاجت باقی نہ رہے۔ اور صرف ادباً و اتباعاً ہی انہیں اختیار کیا جائے یقیناً کاملین کا حصہ ہے۔ مگر اس خلافت کا وہ مقام جو ہر قابل خلافت مومن کے لئے ضروری ہے یہ ہے کہ اگر وہ عملاً اسباب و وسائل سے مستغنی نہیں تو کم از کم اعتقاداً ان کی محتاجگی کے دلدل سے نکلا

ہوا ہو یعنی اگر ہاتھ پیر اسباب سے بے نیاز نہ ہوں تو کم از کم دل ہی ہو اور اس میں یقین صادق موجزن ہو کہ یہ اسباب و وسائل محض حیلے ہیں جو طفل تسلی کے طور پر بہار سے ضعیف الیقین نفوس کے سہارے کے لئے رکھ دیئے گئے ہیں جن میں بذاتہ کوئی ادنیٰ تاثیر نہیں۔ مؤثر حقیقی صرف حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات بابرکات ہے :پس ایسے خلفا میں اگر ترک اسباب سے صنعت گری کی قوت نہیں تو دل سے اعتقاد رکھنے کی قوت بہر حال موجود ہوتی ہے جو ان کے ظاہر کو نہیں تو کم از کم باطن کو ضرور مستغنی رکھتی ہے۔ اور اگر ظاہری خلافت ان کے حصہ میں نہ آئے تو باطنی خلافت ان کا نصیبہ بن جاتی ہے۔

البتہ[1] الظاھر عنوان الباطن کے اصول پر ان کی عملی زندگی اس اعتقاد کا رنگ لئے بغیر نہیں رہتی اور وہ اسباب طبعیہ کی طرف اگر جھکتے بھی ہیں تو کسی تشغف و انہماک کے ساتھ یا اس محتاجگی پر فخر و مباہات کے جذبات کے ساتھ نہیں گرتے بلکہ اجملوا[2] فی الطلب و توکلوا علیہ کے رنگ سے فی الجملہ ہی اس عملی طلب اور اختیار اسباب پر متوجہ ہوتے ہیں۔ دل ان کا غنی رہتا ہے۔ البتہ ان کے اس مستغنیانہ عمل اور اعتقاد کی بدولت یہ وسائل و اسباب سے بے نیازی کا ذخیرہ نفس میں تدریجاً جمع ہوتا رہتا ہے اور آخرت میں ایک دم یکجا ہو کر بالآخر ان میں بھی وہی کن فیکونی کی شان پیدا کر دے گا۔ اور ان کی باطنی قوت غنا اس درجہ متخیلہ پہ حاوی ہو جاوے گی کہ وہ جو خیال باندھ لیں گے۔

---

[1] ظاہر باطن کا آئینہ ہے۔ [2] یہ ایک حدیث ہے جس میں توکل کے ساتھ اسباب کو اختیار کرنے کا حکم ہے۔

وہی متشکل ہو کر سامنے آجائے گا۔ اور جو چاہیں گے وہ بلا توسط اسباب اچانک ہو جائے گا۔ پس یہ دنیا کی خلافت باطنی وہاں حقیقی خلافت بن جائے گی ۔ اور ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون[عله] کا کھلا ظہور ہو جائے گا۔

بہر حال صنع و عمل میں اسباب مادی سے بے نیازی صناعتی خلافت کی روح ہے خواہ اس کا مکمل ظہور عملی طور پر دنیا ہی میں ہو جائے جو شان انبیاء و اولیاء ہے یا اعتقاد کی قوت سے آخرت میں نمایاں ہو جبکہ صلحائے امت اس غناء قلبی کو بذریعہ اعتقاد جزو نفس بنالیں ۔ پس جونہی مکنونات نفس کے کھلنے کا دن (یوم قیامت) آجائے گا۔ وہیں ہی مومن کی یہ اعتقادی قوتیں عملی طور پر نمایاں ہو جائیں گی ۔ اور اس کی خلافت کا ملہ کا ظہور ہو جائے گا جو درحقیقت اسی بنیادی خلافت کا ابھار اور بروز ہو گا۔

غرض صنعت و افعال میں خلافت الٰہی اسی وقت نصیب انسان ہو سکتی ہے جبکہ وہ وسائل مادیہ کا دریوزہ گر نہ رہے خواہ حالاً خواہ استدلالاً خواہ عملاً خواہ اعتقاداً بلکہ خود وسائل اس کے دریوزہ گر اور طالب بنا دیئے جائیں جو غنی عن العالمین کی شان ہے ۔ پس صنعتی خلافت کی اساس و بنیاد بھی وہی غناء اور ماسوی اللہ سے بے نیازی نکلی جو علم و اخلاق کی خلافت کی بنیاد تھی ۔ اور واضح ہو گیا کہ وسائل سے غنی ہوئے بغیر یا انہیں غیر موثر بالذات یقین کئے بغیر اور پھر ان

عله یعنی جنت میں جو تم چاہو گے ملے گا۔

میں انہاک و شغف اور مبالغوں کو ترک کئے بغیر صنعت الہٰی کی خلافت میسر نہیں آسکتی۔ اور جب کہ خلافت کی روح ہی غنار و توکل ٹھہری تو جس درجہ سے غنار و توکل کی طاقت ہو گی اسی درجہ کی طاقت کی خلافت بھی ہو گی۔ خواہ وہ علمی خلافت ہو یا اخلاقی اور صناعتی ہو

مثلاً اگر حق تعالیٰ کے بارہ میں قوت یقین و اعتماد عین الیقین کے مرتبہ پر ہونے کے سبب یہ غنار و توکل درجہ حال میں ہو جس کی جڑیں قلب و قالب کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر ملکۂ راسخہ کی شکل اختیار کر چکی ہوں تو خلافت بھی حقیقی اور ظاہراً و باطناً مستحکم ہو گی جس میں علم اور اخلاق و صنعت اسباب ظاہری سے کلیتہً بے نیاز ہوں گے۔ اور اختیار اسباب محض امتثال امر اور محض آداب عبودیت کے لئے ہو گا۔ نہ کہ احتیاج کی بنا پر کیونکہ وہاں جنود ملائکہ کی نصرت اور خود ان نفوس طیبہ کی وما رمیت اذ رمیت[1] والی اعجازی قوت ساتھ ہو گی جس سے ان کی احتیاج صرف ذات حق سے وابستہ ہو گی کسی غیر سے نہیں۔ یہ خلافت انبیار و اولیار کی ہے۔ اسی کے تحت غزوۂ بدر میں ملائکہ مسومہ ہزاروں کی تعداد میں آئے۔ تاکہ ان قلیل التعداد مجاہدوں کے دلوں میں جماؤ اور استقلال پیدا کریں۔ اسی کے تحت حضورؐ نے اعدار اللہ پر مٹھی بھر کنکریاں

---

[1] قرآن مجید میں نبی کریم صلعم کو خطاب ہے کہ "کنکریں درحقیقت آپ نے نہیں پھینکیں بلکہ خدا تعالیٰ نے پھینکیں" تفصیل آگے آتی ہے۔

پھینک ماریں جو انہیں تیر و تفنگ ہو کر لگیں۔ اسی کے تحت حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ موتہ کا جو شام میں ہوا مدینہ ہی میں مشاہدہ فرماتے ہوئے اعلان فرمایا تھا کہ لڑائی کا جھنڈا اب زید بن حارثہؓ کے ہاتھ میں ہے اور وہ شہید ہو گئے۔ اور اب جعفر طیارؓ کے ہاتھ میں آیا اور وہ شہید ہو گئے۔ اور اب عبداللہ بن رواحہؓ کے ہاتھ میں آیا اور وہ بھی شہید ہو گئے۔ اور اب خالدؓ کے ہاتھ میں آیا اور وہ کامیاب ہو گئے۔ نیز اسی کے ماتحت فاروق اعظمؓ نے ممبر پر خطبہ پڑھتے پڑھتے ایکدم شام کی جنگ کی کمان شروع کر دی تھی۔ اور مدینہ سے ڈھائی سو میل کے فاصلہ پر بغیر کسی لاسلکی کی محتاجگی کے "یا ساریۃ الجبل"[1] کی آواز پہنچا کر جنگ کا رُخ بدل دیا تھا۔ اسی قوت عُمانی کے ماتحت بعد وفات نبوی عرب کے ارتداد کے موقع پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تمام عرب کے مرتدین کے مقابلہ پر تن تنہا جنگ پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اور اسی قوت کے بل بوتہ پر چین کے کروڑوں انسانوں کو صرف دس پانچ ہی تاجر صحابہ نے جنگ کا الٹی میٹم دے دیا تھا۔ اور اسی قوت کے ماتحت رومیوں کی ساٹھ ہزار فوج کو حضرت خالدؓ نے صرف ۶۰ صحابہ کے لشکر سے شکست دے دی تھی۔ اسی قوت کی بنا پر قرآن نے فرمایا تھا کہ اگر تم میں بیس صابر و متوکل ہوں تو دو سو پر غالب ہوں گے۔ اور سو ہوں گے تو ایک ہزار کے لئے کافی ہوں گے۔ اسی قوت

---

[1] یعنی اسے ساریہ پہاڑی کو لو۔

کے ماتحت حضور علیہ السلام صوم وصال رکھ کر ہفتوں کھانا پینا ترک فرما دیتے۔ دو دو ماہ بیت نبوت سے دھواں نہ اٹھتا اور بقاء حیات کے بارہ میں فرماتے:۔

یطعمنی ربی ویسقینی   میرا پروردگار مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

اسی قوت غذار کے ماتحت اولیاء امت کے زہد و ترک کی قوتیں کارفرما ہوئی ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند نے اپنی آخری عمر میں فرمایا کہ الحمد للہ اب مجھے بقاء حیات کے لئے کھانے پینے کی ضرورت نہیں رہی۔ صرف اتباع سنت کے لئے کھاتا پیتا ہوں۔ یعنی ذکر اللہ ہی غذار کے قائم مقام ہو گیا ہے۔ اسی قوت کے تحت صحابہ کرام لمبے لمبے فاقوں کے ساتھ اور کبھی محض کھجور کی گٹھلیوں کو منہ میں ڈال کر چوستے رہنے کے ساتھ مسلسل جہاد اور جنگ میں مصروف رہتے تھے۔ اور معمولی سے معمولی ہتھیاروں، کم سے کم تعداد اور بے سر و سامانی کے ساتھ وقت کی باقاعدہ مرتب کیل کانٹے سے لیس اور بھاری تعداد کی فوجوں کے ساتھ فاتحانہ جنگ کرتے تھے۔ بلاشبہ یہ جنگیں اور یہ احوال زہد و قناعت مادی وسائل کے رہین منت نہ تھے۔ بلکہ قلبی جوش اعتقاد اور قوت یقین کے آثار تھے جس میں اسباب سے کمال استغنار اور مسبب الاسباب سے کمال ربط و احتیاج پس یہ خلاف انبیار و اولیار کی ہے۔

ہاں اگر نوبت یقین عین الیقین کے درجہ کی نہ ہو اور غنا اور توکل کا مادۂ راسخہ قلب میں جڑ پکڑے ہوئے نہ ہو۔ لیکن پھر بھی حق الیقین کے تحت غنا اور توکل کی بشاشت و طمانیت قلب میں پھیلی ہوئی ہو۔ قلب میں انشراح ہو جس میں علم و اخلاق اور صناعات گو ظاہراً تو اسباب سے بے نیاز نہ ہوں مگر اعتقاداً ان اسباب و وسائل کی اہمیت و وقعت پرکاہ کے برابر بھی نہ ہو اور اسباب اختیار کرتے وقت یہ تصور قلب میں راسخ ہو کہ یہ اسباب محض ہمارے ضعیف نفوس کو سہارا دینے کے لئے رکھدیئے گئے ہیں۔ فی نفسہٖ انہیں کسی ادنیٰ تاثیر کی مجال نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان اسباب و مسببات میں کوئی عقلی لزوم ہے کہ اسباب پر نتائج مرتب ہونے ضروری ہوں۔ بلکہ یہ سارا کارخانہ مشیت الٰہی کے تابع ہے جب چاہے ان اسباب پر نتائج مرتب فرمادے جب چاہے روک دے۔ اس لئے اعتماد و بھروسہ کے لائق اسباب نہیں صرف مسبب الاسباب کی ذات بابرکات ہے تو یہ خلافت صلحائے امت کی ہوگی۔ جن کا قلب کم سے کم علم و عمل اور صناعات میں محتاجگی وسائل سے خالی ہوگا۔ گو اعضاء و جوارح خالی نہ ہوں۔ اس قسم کے خلفاء عادل تمام وہمی اور واقعی خطرات سے نڈر ہو کر قانون شریعت پر چلتے اور چلاتے ہیں۔ اور اوامر الٰہیہ کے مقابلہ میں مخالف حق اسباب کا ہجوم انہیں خوف زدہ نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ ایک رخ ہو کر ایسے تمام مادی وسائل کو پس پشت ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ پس یہ خلافت گو حقیقی نہیں ظاہری ہے مگر شبہ حقیقی ضرور ہوگی۔ امراء عادل کے بہت سے

حیرت ناک تاریخی کارنامے اسی اعتقادی قوت غناء و یک رخی کے آثار ہیں جس سے اوراق تاریخ پر ہیں۔

پھر اگر یہ غناء و توکل ایک خیال کی صورت سے قلب میں آمد و رفت اور گذر رکھتا ہے نہ جڑ پکڑے ہوئے ہے نہ انشراح میں ہے اور نہ اس کی بشاشت ہی قلب میں پھیلی ہوئی ہے۔ گویا بسلسلۂ اعتقاد اللہ کے معاملات میں نہ عین الیقین ہے نہ حق الیقین بلکہ ایک اجمالی علم الیقین ہے جس سے یہ دھیان تو آتا رہتا ہے کہ اسباب میں تاثیر خدا کی طرف سے ہے لیکن اس کی کیفیت سے قلب آشنا نہیں جو علم و اخلاق اور صناعات میں بے نیازی اسباب کی عزیمت پیدا کرے تو یہ خلافت عوام مسلمین کی ہوگی جو درحقیقت خلافت ظاہری بھی نہیں بلکہ خلافت ظاہری کا ایک بے جان ڈھانچہ اور کاغذی تصویر کی مانند ہوگا۔ جس میں علم و اخلاق اور صناعات سب کے سب شدت کے ساتھ اسباب ظاہری کے پابند ہوں گے۔ اور اسباب و وسائل کے بے اثر ہونے کی طرف کوئی ذہنی التفات نہ ہوگا بلکہ اسباب و مسببات میں لزوم کا تصور ہر وقت ذہن پر چھایا ہوا ہوگا۔ جس سے مسبب الاسباب پر بھروسہ اور اطمینان کی وہ کیفیت نہ ہوگی جو مطلوب ہے گو اس کی تکذیب بھی ذہن میں نہ ہوگی۔ اس درجہ کے امراء و خلفاء معاشی مہمات اور بقاء اقتدار کی ضروریات میں تو چاق و چوبند ہوتے ہیں لیکن اللہ کے معاملات میں سست، پس و پیش کا شکار اور رسمی اندیشوں اور مصلحت

آفرینیوں میں گرفتار ہوں گے ۔ اور کبھی بھی اپنے داعیہ باطن سے خلافت کے حقیقی نصب العین کے احیاء و تکمیل کی طرف مائل نہ ہوں گے ۔ یوں اتفاقات وقت اور احوال و عوارض کی مجبوریوں سے اعلاء کلمۃ اللہ کا کوئی کام ان سے سرزد ہو جائے تو یہ احوال کا نتیجہ ہوگا خود ان کے کسی عزم و جزم کا ثمرہ نہیں ہوگا ۔

اور اگر غناء و توکل صرف درجۂ قال میں نوک زبان ہے قلب میں اس کا کوئی ریشہ جاگزیں نہیں اور یہ قال بے حال بھی کسی رواجی مجبوری یا زوال اقتدار کے خوف یا مسلم قومیت سے خارج سمجھ لئے جانے کے خطرہ سے ہو گویا زبان سے یہ کہنا بھی کہ "کرتا دھرتا خدا ہی ہے اسباب میں کیا رکھا ہوا ہے" بطور

یرضونکم بافواھھم — زبانوں سے نہیں راضی رکھنا چاہتے

وتابیٰ قلوبھم — ہیں اور دل ان کے اس سے انکاری ہیں۔

کے ہو تو یہاں نہ صرف اسباب ظاہری کی اسیری اور رختا جگی ہی ہوگی بلکہ انہی پر پورا بھروسہ اور اعتماد بھی ہوگا ۔ اور ان کے ہونے نہ ہونے پر ہی قلب کی تسکین اور تشویش کا مدار ہوگا ۔ نیز اسباب میں یہ غلو اور مبالغہ ہی مسبب الاسباب سے بیگانگی اور بے تعلقی کا ذریعہ ثابت ہوں گے ۔ پس یہ خلافت نہیں صرف ادعاء خلافت ہوگا ۔ یعنی خلافت قالی ہوگی جو قوت یقین کے کالعدم ہونے

کے سبب محض صورت یقین سے زبانی دعووں کی صورت سے سرزد ہوگی۔
ظاہر ہے کہ جو نوعیت اس اسلام کی ہے جو صرف زبان پر ہو دل میں نہ ہو وہی
نوعیت اس خلافت کی بھی ہوگی۔ اور اس کے بعد کھلے کفر کا مقام ہے جہاں
صرف بندگی اسباب ہے عبادت مسبب الاسباب نہیں سو اس میں خلافت
یا غناء و توکل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تمام قلبی جذبات اور باطنی ہئیات
عمل سے کھل جاتی ہیں۔ اور عمل ہی ان قلبی مقامات کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔
بہرحال اس سے خلافت کی نوعیت اور اس کے مراتب و درجات کے
ساتھ اس کی روح واضح ہوگئی کہ وہ غناء و توکل اور بے نیازیٔ اسباب
ہے۔ اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ خلافتِ الٰہی کے معنیٰ علم و عمل اور صنعت و افعال
وغیرہ میں مادی اسباب سے منقطع ہونے کے نہیں بلکہ عملاً یا اعتقاداً ان سے
بے نیاز ہو جانے کے ہیں۔ جیسا کہ خود حق تعالیٰ شانہٗ نے بھی اس غناء مطلق کے
باوجود اسباب بھی پیدا کئے۔ اور اپنی قوتوں کو عادۃً انہی کے ضمن میں نمایاں
بھی فرمایا۔ اس لئے اسباب جنگ کے سلسلہ میں ہتھیار اسباب صنائع کے
سلسلہ میں اوزار اور اسباب معاش کے سلسلہ میں کاروبار اپنی جگہ رہے
گا۔ مگر نہ دل میں ان وسائل کی اہمیت اور محتاجگی ہوگی اور نہ عملاً اختیار
وسائل میں غلو اور مبالغہ۔ اس لئے واعدوا لھم ما استطعتم کے
فرمان قدسی نشان پر اس سے کوئی اثر نہ پڑے گا۔ دشمنانِ حق و صداقت کے

مقابلہ میں یہ اعدادِ مستطاع (امکانی تیاری) اپنی جگہ رہے گی۔ اور وہ قلبی غنار اور عملی عدم مبالغہ اپنی جگہ۔ پس آیت کریمہ نے امکانی تیاری کا حکم دیا ہے۔ اس کی نوعیت اور کیفیت پر روشنی نہیں ڈالی کہ وہ کتنی اور کیسی ہونی چاہیئے۔ اس لئے اس امکانی تیاری کی ہدایت تو اس آیت سے حاصل کی جائے گی۔ اور اس کی نوعیت و کیفیت انبیاء علیہم السلام کے طرزِ عمل اور اولیاء و صلحاء کے طرزِ اتباع سے اخذ کی جائے گی۔ اور وہ وہی غنائآمیز جدوجہد ہو گی جس کی طرف سابق میں چند واقعات سے روشنی ڈالی جاچکی ہے۔

پھر یہ صرف شرعی ہی حقیقت نہیں بلکہ دنیا کے عرف عام میں بھی کمال غنا ہی کو سمجھا گیا ہے۔ یعنی کمال وہی مانا گیا ہے جو نفس کا جوہر ہو اور اپنے ظہور میں نہ وسائل ظاہری پر معلق ہو نہ ان کا محتاج ہو۔ ایک فنونِ جنگ سے واقف کار سپاہی جو ہتھیار چلانا جانتا ہے یقیناً اس ناواقف سے بڑھا ہوا سمجھا گیا ہے۔ جو ہتھیار اٹھانا بھی نہیں جانتا۔ کیونکہ اول الذکر اپنی حفاظت کے لئے دوسرے کا محتاج نہیں اور ثانی الذکر ہے۔ پس بناء فضیلت وہی غنار نکلا۔

پھر اس سے بھی برتر وہ ہے جو نہتہ ہونے کے باوجود محض ہاتھ کے داؤ پیچ سے دوسرے کے ہتھیار چھین کر اسے نہتہ کر دے اور خود مسلح ہو جائے۔ کیونکہ وہ ہتھیار کا بھی محتاج نہ نکلا جو پہلے غنار سے اونچا غنار ہے۔ اس سے

بھی آگے وہ ہے جو نفس کی کسی اندرونی طاقت مثلاً نگاہ کو ریاضت سے مضبوط بنا کہ محض آنکھ کی گھوری ہی سے حریف کو گرا لے۔ اور نگاہ سے پتھر تک توڑ ڈالے۔ جیسے مسمریزم والے کرتے ہیں۔ پس یہ ہتھیار چھوڑ ہاتھ پیر ہلانے کا بھی محتاج نہ رہا۔

اس سے بھی بڑھ کر وہ سمجھا گیا ہے جو قوت خیال کی طاقت سے چند کلمات ہی کے ذریعہ دشمن کو زیر کر دے جیسے سحر کی طاقت ہے خواہ وہ سحر حلال ہو یا سحر حرام جسے ریاضت سے حاصل کر لیا جاتا ہے پس یہ ہتھیار، ہاتھ، پیر، اور آنکھ کا بھی محتاج نہ رہا۔ صرف زبان ہلا کر ہی حریف کو گرا لیتا ہے۔

اس سے بھی اونچا وہ مانا گیا ہے جو روحانیت کی بے پناہ طاقت سے دشمن کی صفوں کو تہ و بالا کر ڈالے اور اپنی ہمت باطن سے دلوں کو لوٹ دے جس سے دل مرعوب ہو جائیں اور مسلح ہاتھ پاؤں شل ہو کر رہ جائیں۔ گویا یہ نہ سامان کا محتاج نہ بدن کا محتاج نہ نفس کا محتاج۔ صرف روح کا کارکن نمائندہ ہو۔ خواہ اس طاقت کا ظہور تلوار ہی کے راستے سے ہو۔ مگر اس صورت میں تلوار محض حیلہ کے درجہ میں ہوتی ہے اصل کام اندرونی قوت کرتی ہے اور اس طرح یہ تمام وسائل ایسے شخص کے سامنے بیئے اثر و حقیر بن کر رہ جاتے ہیں۔

اور جب کہ عام قلوب میں ہر اگلے درجہ والے مستغنی کی عظمت و عقیدت سابقہ درجہ والے سے بڑھتی چلی جاتی ہے تو اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ عرف عام میں بھی طاقت کی حقیقت وسائل سے بے نیازی ہے وسائل کی محتاجگی نہیں

یہی وجہ ہے کہ پچھلے لوگ حسی مادوں کے بجائے زیادہ تر نفسانی اور معنوی قوتوں کی تسخیر کو کمال سمجھتے تھے اور ان کا مرکز توجہ زیادہ تر طلسمات، نیرنجات نجومیات، فلکیات، نفوسِ عناصر و افلاک اور خود نفس انسانی کی اندرونی طاقتیں رہیں جنہیں شاق شاق ریاضتوں سے مسخر کیا جاتا۔ اور اپنے نفس کو ان معنوی قوتوں سے قوی کر کے ظواہر سے بے نیاز بنا لیا جاتا۔ بعض نفوس عناصر کی تسخیر کر کے حقائق عناصر تک جا پہنچے۔ بعض نے نفوس فلکیہ اور ارواح سیارات سے کنکشن کیا۔ اور عجائبات افلاک پر مطلع ہوئے۔ بعض نے ارواح سفلی و علوی سے جوڑ لگایا۔ اور اپنے نفس میں خودی کی طاقت پیدا کی۔ بعض نے یہ دیکھ کر کہ ان تمام کائناتی طاقتوں سے کہیں زیادہ طاقتیں خود انسان کے نفس میں موجود ہیں۔ خود اپنی ہی اندرونی قوتوں حواس خمسہ ظاہرہ اور اس سے اوپر حواس خمسہ باطنہ کی طاقتوں کو ریاضت نفس کے ذریعہ ایک مرکز پر سمیٹا مسخر کیا۔ اور ان سے بلا وسائل ظاہری کار فرما ہوئے۔ غرض ان سب غیر محسوس شعبوں میں تسخیر معنویات کر کے

خود اپنی معنویت اس درجہ بڑے آتے تھے۔ کہ وسائل کی محتاجگی باقی نہ رہے۔ اور یہ نفس جہاں بھی ہو باکمال ہو۔ یہ نہ ہو کہ آلات و وسائل کے جہان میں تو نفس باکمال ہو اور اس سے الگ ہو کر بے ہنر ہو جائے۔ یہ بے نیازی اگر عین خلافت نہ تھی تو کم از کم شبہِ خلافت ضرور تھی۔

اسلام نے ان تمام طاقتوں کو مخلوق فانی طاقتیں بتلاتے ہوئے۔ انسان کو خدا کی لطیف اور لامحدود طاقتوں سے مستفید ہونے کی طرف متوجہ کیا۔ اور ارضیات، فلکیات، نفسیات یعنی تمام سفلیات و علویات سے گزار کر الٰہیات کی لامحدود وسعتوں میں پہنچا دیا جو تمام روحانی اور مادی طاقتوں کا سرچشمہ ہیں۔ مگر اس طاقت سے استفادہ کا راستہ اتباع انبیاء بتلایا کیونکہ یہ کوئی کرتبی راستہ نہ تھا کہ فنی طور پر اُسے سیکھ کر کوئی مشق بہم پہنچائی جائے اور اس سے شعبدے اور کرتب دکھا دیئے جاتے رہیں۔ بلکہ ایک ارتقائی اور استکمالی راستہ تھا جس سے سعادت انسانی کی تکمیل پیشِ نظر تھی جو تخلیق انسانی کی اصلی غرض و غایت۔ اور نمائندگی الٰہی کی حقیقی روح ہے تاکہ اس الٰہی طاقت سے انسانی طاقت کے علماً و عملاً حد کمال پر آجانے سے انسان کا استغناء اور وسائل ظاہری سے بے نیازی بھی حد کمال پر آجائے اور اس طرح اس میں خلافت الٰہی اپنی حقیقت کے ساتھ جلوہ گر ہو۔

لیکن آج کی مادہ پرست قوموں کی تمام تر ہمت حسّی مادوں کی تسخیر اور ان کی حسّی خاصیتوں کو آلات کے ذریعہ ابھار ابھار کر کچھ بدنی منافع حاصل کرتے رہنے میں محدود ہو چکی ہے۔ ان کی طرف سے روحانیت اور معنویت رہے یا جائے سب برابر ہے۔ وہ مشینری آلات کے ذریعہ مادوں کے جگہ میں گھس کر فنافی المادہ ہو چکی ہیں۔ گویا سائنس کی راہوں سے انسان اپنی معنوی قوتوں کا ذخیرہ لوہے لکڑی اور پیتل کو سونپ کر خود کورا ہو بیٹھا ہے۔ اگر یہ سامان فراہم ہے تو وہ باکمال ہے ورنہ بے کمال۔ پہلی صورت میں انسان باکمال بنتا تھا۔ اور اس دوسری صورت میں انسان کو آلہ کار بنا کر لوہا لکڑی اور برق و بخار وغیرہ اپنے کمال ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ ان اسباب کے نہ ہونے کی صورت میں انسان بے ہنر اور عاجز بن جاتا ہے یہ انسانیت کی انتہائی پستی اور ہیچ میرزی ہے کہ اس نے اپنی جوہری طاقتیں ختم کر کے لوہے پیتل کو سپرد کر دیں اور خود ان کا دریوزہ گر بن گیا۔ اور پہلے لوگوں کا یہ اعلیٰ ترین عروج تھا کہ وہ اس لوہے پیتل کی طاقتیں ان سے چھین کر خود اپنے نفس کو قوی مضبوط اور باکمال بنا لیتے۔ اور ان اشیاء کو صرف ایک حیلہ کی حیثیت سے اختیار کئے رہتے تھے۔ نظر ان کی مسبب الاسباب پر ہوتی تھی۔ اسی لئے جن میں یہ نکھار حد کمال کو پہنچ جاتا تھا وہ عملاً بھی ان وسائل کے بغیر اپنے کمال کا اظہار کر سکتے تھے۔

پس آج کا انسان الٰہیات اور فلکیات کی تو کیا عنصریات کی ادعاء حد

نفوس حتیٰ کہ خود اپنی نفسیات کو بھی اپنے اندر جذب نہ کر سکا۔ وہ آکر گرا تو جسمانیات اور وہ بھی فلکی نہیں سفلی اور سفلیات میں بھی محض مادیات اور حسیات اور وہ بھی بمحتاجگی آلات و وسائل میں آکر گرا جس سے اس کی دریوزہ گری اور محتاجگی یا پابستگی اور زیادہ بڑھ گئی۔ اور وہ شرف انسانیت جو غنا و بے نیازی سے پیدا ہوتا، خاک میں مل گیا جو بلاشبہ انسانیت کی حد سے گذری ہوئی پستی اور ذلت و درماندگی ہے۔ مگر طرہ اس پر یہ ہے کہ اس ذلت و پستی پر رب العزت کی خلافت کا دعویٰ اتنا کہ زمین و آسمان ایک کر دیا گیا ہے۔ پس جا تو رہی ہے انسانیت حضیض ذات کی طرف اور خود غلط زعم کیا جا رہا ہے اس کے اوج رفعت پر پہنچ جانے کا۔ اور نہ صرف رفعت و عزت ہی کا بلکہ اللہ کے واحد نمائندہ اور خلیفہ بن جانے کا۔ ولاینال عھدی الظلمین

پس اگر خلافت الٰہی سے اتشبیہ اور تقریب کچھ طرز عمل تھا تو ان پچھلوں کا تو تھا جو معنوی اور نفسانی کمال پیدا کر کے طلسمات و نیز نجات وغیرہ کی صورت میں نفس کو ظواہر سے بے نیاز کر لیتے تھے۔ گو ان میں بعض مبطل تھے اور بعض محق یعنی روحانیت والے کمال استغنا پیدا کر کے حقیقی خلافت کے مقام پر آجاتے تھے۔ اور یہ نفس یا آفاق کی مخفی طاقتوں کے تسخیر کنندے خلافت کی تشبیہ اختیار کر کے خلفاء کے مشابہ بن جاتے تھے۔ لیکن آج کے مادہ پرست طبقے خالص حسیات کے خوگر بن کر اور مادیات کے محتاج محض ہو کر نہ صرف خلافت اور

ثبہ خلافت ہی سے بعید ہیں بلکہ خلافت کی صورت و حقیقت دونوں ہی کے لئے مخرب ثابت ہو رہے ہیں کیونکہ ان کے یہاں خلافت کی اولین خشت غنا و استغنا رہی بذار دہے "تا بعمارت خلافت چہ رسد؟"

اس کا یہ مطلب نہیں کہ استغنا و وسائل کا اعتقاد یا حال کئے بغیر ان مادی اسباب کے طبعی خواص و آثار ظاہر نہ ہوں گے۔ بلکہ یہ ہے کہ خلافت کا تحقق نہ ہوگا۔ آج اور آج سے پہلے دنیا کی بہت سی مادہ پرست اقوام سے ان اعتقادات و احوال کے بغیر بھی مافوق العادت صناعیوں اور مادی اختراعات کا ظہور رہا۔ اور آج بھی بہت سی مادی قومیں ان وسائل سے بلا اعتقاد تاثیر الٰہی تمدن کے حیرت ناک کرشمے دکھلا رہی ہیں جس سے سطحی طور پر ان کے خلفاء الٰہی اور ایجاد و اختراع میں نائب خداوندی ہونے کا شبہ بھی ہونے لگتا ہے لیکن یہ خلافت نہیں صورت خلافت کی ایک ظلماتی پرچھائیں ہے جس میں نہ صرف یہ کہ خلافت کی روح (غنا و توکل) موجود نہیں بلکہ اس کی ضد موجود ہے پس طبعی خواص و آثار کا تحقق یہاں ضرور موجود ہے۔ مگر منصب خلافت اس کے آس پاس بھی نہیں صرف استدراجاً یہ مادی کرشمے ان کے ہاتھوں نمایاں کئے جا رہے ہیں نہ کہ کسی مقبولیت کی بنا پر جو روح خلافت ہے۔ پس جیسے کھانے پینے میں ذائقہ نیت پر موقوف نہیں مگر اجر و ثواب نیت پر موقوف ہے۔ ایسے ہی مادیات کے طبعی آثار و خواص کا ابراز غنائے اسباب کے عقیدہ یا حال پر موقوف نہیں لیکن

خلافت کا منصب اور خدا کا مقبول نائب ہونا بلاشبہ اس غناء و توکل کی شان پر معلق ہے۔

پس جو قومیں رات دن لوہے، لکڑی، اینٹ، پتھر اور عام مادی وسائل کی محتاجگی اور غلامی میں نہ صرف بسر ہی کر رہی ہیں بلکہ ان مادیات کی بندشوں نے ان کے خیال تک کو اپنا اسیر اور قیدی بنا لیا ہے جس سے وہ روحانیت سے بیگانہ اور منقطع ہیں۔ نہ وہ غناء و توکل سے عقیدۃً سرفراز ہیں نہ حالاً تو انہیں خلافت الٰہی سے کیا تعلق کہ خلافت الٰہی کی تو خشت اول ہی ان وسائل سے غناء ہے حالاً ہو یا اعتقاداً۔ خلیفۃ الٰہی ہتوڑہ و آرہ اور بسولہ و نہان سے نہیں بن سکتا بلکہ علم و اخلاق اور صنعت کاری میں غناء و توکل کے درجات طے کرنے سے ہوتا ہے۔ اگر علم بے کتاب و بے معید و استا کا مصداق بن کر علم لدنی بن جائے۔ اخلاق تخلق با خلاق اللہ کا مصداق ہو کر خلق حسن ہو جائے قول گفتۂ او گفتۂ اللہ بود کا مصداق ہو کر القاء و الہام اور فراست بن جائے اور فعل ومارمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمٰی کا مصداق بن کر فعل صدق ہو جائے۔ گویا اس کا کہا ہوا اور کیا ہوا اس کا نہ ہو بلکہ اس کے خدا کا کہا ہوا اور کیا ہوا ہو۔ اور وہ حقیقی معنی میں قولاً و فعلاً نمائندۂ حق ہو جائے تو خلافت کامل ہو گی ورنہ حسب نقص درجات ناقص رہ جائے گی۔ اب جن اقوام میں خلافت کی یہ بنیاد ہی ندارد ہو نہ عقیدۃً موجود ہو نہ حالاً تو ان پر منصب

خلافت کو چھپاں کر کے انہیں خلفاء الٰہی یا عملی مؤمن کہنا اور ان کے مقابلہ میں مسلم اقوام کو جو کم از کم غیبت تاً ان مادی اسباب کو باوجود استعمال کرنے کے کوئی اہمیت نہیں دیتیں بلکہ صرف مسبب الاسباب ہی کو مؤثر حقیقی مانتی ہیں عملی کافر اور لفظی مؤمن کہنا کہاں کا انصاف اور حق پسندی ہے اگرچہ وہ محکوم ہی کیوں نہ ہوں۔ ولعبد مؤمن خیر من مشرک ولو اعجبکم

مگر یہ عنار حقیقی جو ان تینوں خلافتوں علمی، اخلاقی اور صنعتی و افعالی کی روح ہے اسی وقت نصیب ہو سکتا ہے جب اللہ کے علمی قرآن یعنی کتاب اللہ سے تو علم حاصل کیا جائے۔ اور اس کے استدلالی اور برہانی قرآن یعنی کائنات اللہ کی محسوس مثالوں سے اس کی معنویات کو سمجھا جائے۔ اور اس کے اخلاقی اور تعمیلی قرآن یعنی رسول اللہؐ کے اسوۂ حسنہ سے عمل بالقرآن کا ڈھنگ سیکھا جائے اور عملی دستور زندگی بنا کر زندگی کے ہر ہر گوشہ میں جذبۂ اتباع سنت کے ساتھ اس کی پیروی کی جائے۔ پس کتابی قرآن حق کا راستہ دکھائے گا۔ کائناتی قرآن اس راستہ کو فہم کی گہرائیوں میں اتارے گا۔ اور اللہ کا عملی قرآن یعنی رسول برحق اپنے عملی اسووں سے اس پر عمل کرائے گا۔ جس سے نفس میں ملکات خلافت راسخ ہوں گے اور ظاہر ہے کہ جب علم کتاب اور دلائل علم کتاب سے مقصود اثبات مدعا ہے۔ اور مدعا سے مقصود اس پر عمل پیرائی ہے۔ اور عمل کا نمونہ رسول کی ذات ہے تو تینوں قرآنوں کا

حقیقی مقصد اسوۂ رسول پر چلنا نکل آتا ہے جس سے صاف واضح ہے کہ اس علمی قرآن کا عملی پہلو یہ کائنات نہیں کہ وہ تو صرف تمثیلی اور برہانی قرآن ہے۔ بلکہ عملی قرآن ذات محمدی ہے جس نے قرآنی ہدایات کو براہ راست صاحب قرآن (حق تعالیٰ) سے سمجھ کر اس پر عمل کرنا سیکھا اسے کرکے دکھایا۔ اور ہر ہر ہدایت قرآنی کا عملی خاکہ اور نمونہ امت کے سامنے پیش کر دیا۔ اس لئے اس عملی قرآن کے نقش قدم کی پیروی ہی فی الحقیقت قرآنی ترقی ایمانداری اور خلافت الٰہی ہو گی۔ پس قرآن کا اصل مقصود اتباع سنت اور اقتدائے اسوۂ حسنہ نکل آتا ہے جس کے لئے یہ ساری کائنات ایک وسیلہ محض رہ جاتی ہے۔ نہ یہ کہ اس عملی قرآن (ذات نبوی) کے نمونۂ عمل سے تو قطع نظر کر لی جائے اور علمی قرآن یعنی کتاب اللہ کی محض تعبیرات کو لے کر اپنے مقاصد کی بلاغت بیانی کا آلۂ کار بنا لیا جائے کہ تعبیرات قرآن کی ہوں۔ اور ذہنی منصوبے اپنے ہوں جن کو اس کی بلاغت بیانی کے پردوں میں چھپا کر پیش کر دیا جائے۔ اور اس اسلوب پر قرآنی مقصد مادہ کی توڑ پھوڑ اور مادی تصرفات ٹھہرا کر اس کا نام عمل بالقرآن رکھ لیا جائے۔ اگر یہی عمل بالقرآن ہے تو اس سے زیادہ گھاٹے کا سودا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ اس مادی صنعت گری کو قرآنی عمل کہہ کر جب صرف مادہ کی توڑ پھوڑ ہی میں عمر عزیز گنوا دی جائے گی تو یہ مادہ اور مادی لذات تو یوں نہ رہیں گی کہ وہ ختم عمر پر ختم ہو جائیں گی اور اخروی

لذات یوں نہ ہوں گی کہ انہیں مقصود بناکر دنیا میں ان کی تحصیل و تکمیل کا ارادہ ہی نہیں کیا گیا تھا تو یہ صحیح معنی میں خسر الدنیا و الآخرہ کا مصداق ہو جائے گا۔ جس کا خلاصہ دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ یہ توڑ پھوڑ کنندہ بندۂ سائنس یا عبد الاسباب خلیفۂ الٰہی تو یوں نہ بنا کہ بندگیٔ اسباب کے ساتھ یہ مادی تصرفات بلا روحانیت اور بلا غناء نفس خلافت نہیں خلافت کا لاشہ ہیں جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اور آخرت میں خلیفہ یوں نہ ثابت ہوا کہ بنا ر خلافت یعنی مستغنیانہ علم۔ غنیانہ اخلاق اور بے نیازانہ کسب عمل اس نے مقصد قرآن ہی نہیں سمجھا کہ اسے اختیار رکھتا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ یہ نفس ناکارہ علم و معرفت سے کورا رہ کر جہان مابعد میں اس طرح پہنچے گا کہ نہ تو وہ اللہ ہی کا خلیفہ اور نمائندہ ہوگا کہ مادی وسائل سے بے نیازی انہیں قائم ہی نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ وہ اپنا ہی نمائندہ ہوگا کہ وہاں اس کو رسے اور عاری نفس کی وہ خودی اور خودداری قائم نہ رہے گی جو دنیا میں ان فانی وسائل برق و بخار، انجن مشین اور لوہے لکڑی کے بل بوتہ پر قائم تھی تو صحیح معنی میں یہ نفس خسران دنیا اور حرمان آخرت کا مورد ہو کر رہ جائے گا۔ اور اس طرح یہ نام نہاد خلافت خلافت نہیں حماقت ثابت ہوگی۔ اگر معاذ اللہ عمل بالقرآن کا نتیجہ یہی حرمان و خسران دارین ہے تو قرآن کو دنیا میں آنے اور اچھی خاصی مخلوق کو جو قیصر و کسریٰ کے زیر سرپرستی خلیفۂ الٰہی بنی ہوئی تھی دارین کے حرمان و خسران میں مبتلا کرنے کی آخر کیا ضرورت پیش آئی تھی ؟

رہا فی نفسہ صنعت و حرفت اور مادی تصرفات کا سوال سو نہ قرآن اس کا مخالف ہے نہ دین نے اس سے ممانعت کی ہے اور نہ کوئی عقلمند اس کے خلاف آواز اٹھا سکتا ہے۔ دنیا میں رہ کر دنیوی ضروریات سے روک دیا جانا عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے مگر ؎

کار دنیا کن و اندیشۂ عقبیٰ مگذار

تا بعقبیٰ نہ رسی دامن دنیا مگذار

یعنی یہ ضرور ہے کہ یہ صنائع اور مکاسب اصول قرآنی کی رو سے دارین میں کار آمد اور موجب فلاح جب ہی ہو سکتے ہیں جبکہ وہ خود مقصود نہ ہوں بلکہ کسی اونچے نصب العین کے وسیلہ کی حیثیت سے استعمال میں آئیں جن میں نہ غلو ہو نہ مبالغہ اور نہ ان کے ساتھ مقاصد کا سا غیر معمولی شغف اور دلچسپی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نصب العین ہی خلافت ہے جس کا حاصل اعلاء کلمۃ اللہ ہے اور جس کا طریقہ خدائی علم سے آراستہ ہونا۔ خدائی اخلاق سے متخلق ہونا اور خدائی رنگ صنعت گری سے رنگین ہونا ہے۔ اور سب کی بنیاد وہی غناء عن الوسائل ہے نہ عشق وسائل اس لئے مادی وسائل اور مادی تصرفات خود خلافت نہیں بلکہ خلافت کے ادنیٰ ترین وسائل ثابت ہوتے ہیں۔ اور کسی طرح جائز نہیں ٹھہرتا کہ انہیں مقصود اصلی سمجھنے یا ان کے ساتھ مقصود کا سا برتاؤ کرنے اور ان میں ڈوب جانے کو عین ایمانداری خلافت خداوندی

اور ایمان و تقویٰ پکارا جانے لگے۔ کہ ایسا کرنا دین کا حلیہ بگاڑنا اور اسے ادھیڑ کر از خود بننا اور وہ بھی سونے کے بجائے زنگ آلود سیاہ لوہے کے تار سے بننا ہے جو نہ خوش نما ہے نہ بقا پذیر ہے نہ مقبول ہے۔

اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ دین صنعت و حرفت اور تسخیر عالم میں کمال حاصل کرنے یا اس پر قابو پا لینے کا تو مخالف نہیں مگر اس کے نزدیک عام طبعی ضروریات زندگی کے معمولی کسب و اکتساب کو چھوڑ کر ایجاد و اختراع اور تسخیر کائنات کا مطلوبہ طریقہ مادی تصرف نہیں بلکہ روحانی تصرف ہے۔ عالم کو مادی طاقت سے زیر کرنا نہیں بلکہ روحانی قوت سے قابو میں لاتا ہے جو اسباب و وسائل مادیہ سے بے نیاز طریقہ ہے۔ ظاہر ہے کہ روحانی تصرفات کا راستہ عقل و استدلال سے طے نہیں ہوتا بلکہ عشق الٰہی اور اتباع نبوی کے شغف سے طے ہوتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ مادی اسباب میں غلو اور مبالغہ سے طبیعت کو روکنے کی خو پیدا کر لی جائے۔ یہ راستہ مضبوط بھی ہے اور دوامی بھی ہے جو دنیا سے لے کر آخرت تک قائم رہتا ہے۔ اور اس پر مسافت ہر وقت اور ہر عالم میں ممکن رہتی ہے۔ گویا آخرت بھی بنتی ہے اور دنیا بھی ہاتھ سے نہیں جاتی۔ بخلاف مادیت محضہ اور وسائلی تصرفات کے کہ یہ راستہ جوہری راستہ بھی نہیں جو صرف انسان کی اندرونی طاقت سے طے ہو۔ اور بلحاظ نتیجہ یقینی اور قطعی بھی نہیں کہ اس پر ثمرات کا

مرتب ہونا لازمی ہو پھر ہر ایک کے لئے عام بھی نہیں کہ سب کو یہ وسائل میسر ہی آجائیں - اور ساتھ ہی پائدار بھی نہیں کیونکہ آخرت کی پہلی ہی منزل پر یہ تمام وسائل اور تصرفات بیکار ثابت ہوتے ہیں جس سے دنیا تو ختم ہو جاتی ہے - اور آخرت بنتی نہیں - پس پہلا راستہ تو فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرت حسنۃ کا مصداق ہے - اور دوسرا راستہ خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہے -
حاصل یہ ہے کہ اسلام صنعت گری کی قوت پیدا کرنے اور اسے ظہور میں لانے کا مخالف نہیں بلکہ داعی ہے - مگر اپنے ہی راستہ سے وہ چاہتا ہے کہ یہ خلیفۂ الٰہی حقائق کائنات پر مطلع ہو - اور ان کا گہرا مطالعہ بھی کرے مگر محض پیشانی کی آنکھ سے نہیں بلکہ پیش آنی کی آنکھ سے وہ ان میں تصرفات بھی کرے - مگر خارجی وسائل کا محتاج ہو کر نہیں بلکہ خود اپنی اندرونی طاقت کے بل بوتہ پر - پس خارجی وسائل کی محتاجگی سے مادہ کی توڑ پھوڑ خلافت نہیں بلکہ خلافت کی ظلماتی پرچھائیں ہے - جو ہمیشہ اصل کے خلاف چلتی ہے -
لیکن پھر بھی جو لوگ اس واقعی حقیقت کے برخلاف کائنات میں محض مادی تصرفات اور مادی توڑ پھوڑ میں مبالغہ اور غلو ہی کو سب کچھ جانتے ہیں اور اسی کو ایمانداری اور خلافتِ کبریٰ سمجھ رہے ہیں - ان کی غلطی کا منشا وہی صحیفۂ کائنات کو قرآن کا عملی پہلو سمجھ کر اسے عملی قرآن کا لقب دے دینا اور اسی سے عملی نمونے اخذ کرنا ہے - درحالیکہ یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ صحیفۂ کائنات عملی

قرآن نہیں جس سے عمل کے نمونے لئے جائیں بلکہ صرف تمثیلی اور برہانی قرآن ہے
جس سے نظریات قرآنی کے اثبات کے لئے دلائل نظر و فکر کے نمونے لے کر
نظر کو مصنوع سے صانع تک پہنچانا ہے وہ خود انسان کے لئے عمل نہیں کہ
اس کے مادوں کی توڑ پھوڑ کو مقصدِ حیات سمجھ کر رات دن اسی کے جوڑ توڑ
سے اسی کی مادی گہرائیوں میں غرق ہو جانا اور دخان و بخارات اور برق و باد وغیرہ
کے نئے نئے نمونوں کو قابو میں لاکر دنیا پر انہیں آزمانا ہے جس کا نتیجہ خود کو اور
ساری دنیا کو برباد کرتے رہنا ہے پس عملی قرآن جس سے قرآن کے تقاضا کردہ عملی
نمونے اور اسوے اخذ کئے جائیں کائنات نہیں بلکہ پیغمبر کی ذات ہے۔
کائنات دعاوی قرآنی کے لئے صرف حسّی دلائل کا مجموعہ ہے نہ کہ ان دعاوی کا
تقاضا کردہ عمل۔ پس اسوہ اور نمونہ صرف اسی ذات بابرکات سے حاصل
کیا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ ذات نبوی کے اس اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل
کی روح مادی شغف نہیں بلکہ وہی علم الٰہی، غنائے کامل، وسائل مادی سے
بے نیازی، اور ان پر روحانی تسخیر و تصرف سے قابو پانا ہے، جو آپ کے ہر
شعبۂ زندگی سے نمایاں ہے۔ پس آپ کے یہاں اسباب معاش کی فراہمی ضرور
ہے مگر اجمال طلب اور توکل کے ساتھ، جہاد میں ہتھیار ضرور ہاتھ میں ہے۔ مگر
ہتھیار کی قوت سے زیادہ قوت یقین اور انابت الی اللہ کی طاقت آگے آگے
ہے۔ نظم ملت کا سامان بھی ہے۔ مگر اسی تشکیلات اور وسائل عامہ کے راستہ

سے نہیں بلکہ ایمان باللہ اور عمل صالح کے راستہ سے ۔

ظاہر ہے کہ اس فرق کے بعد "دو قرآن" کا نظریہ باقی نہیں رہتا کہ جیسا کہ سابق میں عرض کیا جا چکا ہے ۔ اگر نظریہ بنتا ہے تو "تین قرآن" کا بنتا ہے کہ ایک اللہ کا علمی قرآن ہے جو اوراق میں مرقوم ہے یعنی کتاب اللہ ۔ ایک اس کا برہانی اور تمثیلی قرآن ہے جو اوراق عناصر و موالید میں مکتوم ہے یعنی کائنات اللہ (جسے غلطی سے عملی قرآن باور کرا دیا گیا ہے) اور ایک اللہ کا عملی قرآن ہے جو ذات محمدی میں معصوم ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (جسے کلیتہً نظرانداز کر دیا گیا ہے ۔)

نظریہ کے بدل جانے سے قدرتاً مسائل کا رُخ بھی بدل گیا ۔ یعنی عملی قرآن ذات نبوی ثابت ہو جانے کے بعد اب یہ مسائل قائم نہیں رہ سکتے کہ قرآن کی رو سے مسلمانوں کی اصلی ترقی کا میدان ہواؤں میں اڑنا ، بادلوں میں گھس جانا ۔ زمینی مسافتیں برق و باد سے لمحوں میں طے کر لینا ، لاسلکی سے مشرق و مغرب کی خبروں کو ایک کر دینا ، ایکسرے وغیرہ سے بدن کے چھپے ہوئے امراض کا سراغ لگا لینا ، دل کی دھڑکنوں کے اسباب و علل پر بذریعہ آلات مطلع ہو جانا اور رحم مادر کے مکنونات کو باہر لے آنا ، یا پھر ان اسباب کی مفرطانہ تجارت سے رسمی جاہ و جلال اور کروڑپتی پیدا کر لینا ۔ یا ان میں کے مہلک آلات سے دنیا پر استبداد اور اقوام دنیا پر استعباد (غلام سازی) مسلط کر دینا وغیرہ وغیرہ

سے۔ بلکہ اب ہم انسانی ترقی کو صحیفۂ کائنات میں ڈھونڈنے کے بجائے ذات
نبوی کے اسوؤں میں تلاش کریں گے۔ تو وہاں اس نمائشی خلافت یا تخریبی
خلافت کے نمونوں کے بجائے تعمیری خلافت اور عمل بالقرآن کے نمونے ملیں
گے جن کی روح علم الٰہی معرفت ذات وصفات عظمت شرائع، اخلاق ربانی،
غنا و ایثار۔ خدمت خلق اللہ اور خلق الٰہی کو مادیات کے دلدل سے نکال کر
روحانیت کے میدان میں پہنچانا۔ اور نفسانی عیش سے روحانی لذات کی
طرف منتقل کرنا نمایاں ہوگا۔ وہاں فضاء میں اڑنے کے بجائے روحانی فضاؤں
میں عروج کرنا۔ مشرق و مغرب ایک کر دینے کے بجائے الہیاتی علوم سے
عرش سے فرش کو ایک کر دینا اور فرش زمین کو عرش بریں کی الٰہی خبروں سے
منور بنا دینا۔ بدن کے امراض کے بجائے قلوب و نفوس کے چھپے ہوئے مکائد
اور روگ کھول دینا جن کی اصلاح سے بدن بھی صالح بن جائے۔ دل کی حسی
دھڑکنوں پر مطلع ہونے کے بجائے لطیفۂ قلب کی کھٹک اور پراگندگیوں پر
مطلع ہو کر سکون قلب کا سامان مہیا کرنا جس سے یہ صنوبری مضغۂ گوشت
بھی ساکن ہو جائے رحم مادر کے مکنونات کھولنے کے بجائے ارواح و انفس
کے مخفی اسرار کھولنا۔ نمائشی کر و فر کے بجائے تواضع للہ فروتنی اور مساوات
کے جذبات ابھارنا مہلک آلات سے مخلوق خدا کو بیدردانہ انداز سے تباہ
کرنے کے بجائے رحمت عامہ اور عالمی امن و سکون کے دروازے کھول دینا۔

اور عالمگیر اخلاق کاملہ سے دیانت و امانت، محبت و ہمدردی، ایثار و احسان کے جذبات پیدا کر دینا۔ معاصی کو رسمی انداز سے روکنے سے زیادہ دلوں میں معاصی سے نفرت بٹھلا دینا۔ اور انفس میں نفس و شیطان کی حکومت کے بجائے عقل و شرع کی حکومت قائم کر دینا وغیرہ واضح ہوگا۔ جو حقیقتاً خلافت الٰہی کا تقاضا کردہ عمل اور الیوم اکملت لکم دینکم کا سچا مصداق ہے۔ جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ دنیا کو سنوارنے کا طریقہ اچھی چیزیں بنانا نہیں بلکہ اچھے آدمی تیار کرنا ہے۔ خلافت کے معنی فیکٹریاں قائم کر کے بازاروں کو تجارتی سامانوں سے بھر دینا نہیں بلکہ دل و دماغ کی زنگ آلود فیکٹریوں کو صاف کر کے ان پر پاکیزہ افکار، پاکیزہ عقائد اور پارسائی کے اعمال ڈھال کر نکالنا ہے جس سے انسانیت نشو و نما پائے اور بہیمیت اور درندگی کو فروغ پانے کا موقع نہ ملے۔

اس فرق کے بعد عالم کے ہیرو۔ اور خلفاء الٰہی ملحدان یورپ یا ملحدان ماضی فرعون ہامان، نمرود اور شداد یا قیصر و کسریٰ ثابت نہ ہوں گے جنہوں نے مادی سائنس کے شاہکاروں سے دنیا کو معمور کیا۔ بلکہ اس اسوۂ محمدی کی روشنی میں صدیق و فاروق، علی و عثمان، خالد و ابو عبیدہ۔ اور اوپر چل کر حضرت موسیٰ و عیسیٰ، حضرت نوح و ابراہیم اور تمام انبیاء سابقین۔ اور تمام صلحائے عالم ثابت ہوں گے۔ جنہوں نے صفحات کائنات کا گہرا مطالعہ کر کے

ان مادی شاہکاروں کو مٹانے میں اپنی پوری قوت صرف فرمائی۔ روحانیتوں کو اجاگر کیا اور مادیت کو سرنگوں بنایا اور مادی وسائل کی محتاجگی سے مخلوق کو نکال کر روحانیت کی آزاد فضا میں پہنچایا تا آنکہ مادی زندگی کے سکون و لذت سے بھی محروم نہ رہے اور روحانی زندگی تو ان ہی کا حقیقی حصہ تھی۔

رہا یہ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگوں میں وہی وسائل لاتے تھے جو دشمن لے کر آتا تھا سو یہ نہ کوئی عقلی نظریہ ہے نہ تاریخی۔ کبھی تشدد کا مقابلہ عدم تشدد سے ہوتا ہے جیسے مکہ کی زندگی میں ہوا۔ اور آج بہت سی اقوام نے اس اصول پر طاقتور دشمنوں سے نجات حاصل کر لی۔ اور کبھی حرب وضرب کا مقابلہ صبر اور مقاومت مجہول سے کیا۔ اور فتح پالی جس سے واضح ہے کہ اسلحہ کے مقابلہ میں کبھی اخلاقی قوت اسلحہ سے بھی زیادہ کام دیتی ہے۔ اس سے بھی اوپر کا مقام روحانی قوت ہے یعنی تعلق مع اللہ اور رابطۂ عبد ومعبود جو ہر قوت سے بڑھ کر قوت ہے۔ اگر اسلحہ اور سامان جنگ کی قلت کے ساتھ روحانیت قوت یقین توکل وصبر واستقامت اور موت شہادت کی محبت کا جوش ہو۔ اور انسان اللہ کا سپاہی بن کر میدان میں آجائے تو اس کے سامنے بڑے بڑے سامانوں والی فوجیں نہیں ٹھہر سکتیں۔ سلف کی جنگیں اسی عنوان کی تھیں۔ وہاں نہ اس کی پرواہ کی جاتی تھی کہ پہلے فوج کی تعداد دشمن کے عدد کے برابر کریں۔ نہ اس کی کہ سامان

دشمن کے جیسے سامان کے برابر ہو جائے ۔ نہ اس کی کہ پہلے مال و دولت کم از کم دشمن کے اموال کے مساوی ہو جائے تعداد کے بارہ میں تو ان کے سامنے ہدایت ربانی تھی کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ واللہ مع الصابرین ۔ اور ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین الخ جس میں تعداد کی قلت کا تدارک صبر و استقامت سے کیا گیا ہے نہ کہ تعداد برابر ہو جانے کے انتظار میں اصل مقصد سے روکا گیا ہے ۔

مصارف جنگ کی قلت و کثرت کے بارہ انہیں حضرت صاحب شریعت کا یہ فرمان پیش نظر رہتا تھا ۔

انکم لن تسعوھم باموالکم	تم دنیا کی اقوام پر اپنے مال و دولت (یعنی
ولکن تسعوھم باخلاقکم	وسائل مادی) سے غلبہ نہیں پا سکتے بلکہ اپنے
	اخلاق (یعنی وسائل روحانیہ) سے غالب آ سکتے ہو ۔

سامان رسد کے بارہ میں ان کے پیش نظر یہ منظر تھا کہ حضور سرور دو عالم غزوہ احزاب میں خندق کھود رہے ہیں ۔ اور فاقوں کی کثرت سے بدن کو سہارا دینے کے لئے پیٹ سے پتھر بندھے ہوئے ہیں جب کہ دشمنوں کے پاس سامان رسد کی کوئی کمی نہ تھی ۔ پس یہ نظریہ کہ حضور جنگوں میں وہی سامان اور ویسے ہی اسلحہ لے کر تشریف لائے تھے جیسے دشمنوں کے ہوتے تھے نہ عقلی ہے نہ تاریخی ۔ ہر قوم اپنے مزاج کے مطابق سامان کرتی ہے ۔ مسلم قوم کا اصلی مزاج سامانوں پر توکل نہیں بلکہ اللہ پر بھروسہ ۔

اور اپنی عبدیت کے پیش نظر یا نفس کو فی الجملہ تسلی دینے کے لئے کسی حد تک وسائل کا اختیار کر لینا ہے ۔ یہی ان کی تاریخ ہے ۔ اور یہی ان کا مزاج ۔ دوسری اقوام کے مزاجوں کی رعایت میں غرق ہو جانے یا مرعوبیت کے ساتھ اقوام کی نقالی کرنے یا آج کی متمدن اقوام کی مادی ترقی کو اسوہ اور نمونہ بنا کر اس کے معیار پر اپنے کو جانچنے سے یہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ اگر ہم اپنے اصلی مزاج پر آ جائیں ۔ اور یہ جدید رجحانات ۔ اور جدید تقاضوں کے پورا کرنے کے زبان زد عنوان کو ترک کر کے اپنے ہی اصلی رجحانات اور بنیادی تقاضوں کو پورا کرنے لگیں تو یہ ذہنی کشمکش ختم ہو جائے جس نے آج پریشانی میں ڈال رکھا ہے ۔ مقصد سلف کا مذاق پیدا کرنا اور اسی مذاق پر ظاہری سامان اور مادی وسائل کا مہیا کرنا ہے کہ اس کے بغیر صحیح نتائج پیدا ہونے کی صورت نہیں ہے ۔ ان تصریحات کے بعد ہمارے نزدیک مادیات سے ملّا کی جہالت مضر نہیں رہتی ۔ البتہ مخالف ملّا کی جہالت روحانیات اور اسلامی مذاق سے مہلک ثابت ہوتی ہے ۔ کیونکہ ملّا تو روحانیات کا عارف بن کر مادیات کے نشیب و فراز سے بھی نابلد نہیں رہتا ۔ لیکن بے بصیرت مخالف ملّا سائنس کی ناتمام معلومات پر بھروسہ اور ناز کر کے حقائق الٰہیہ سے یکسر غافل رہ جاتا ہے یعنی طاعت کی راہ سے ملّا تو عارف اسرار ہو جاتا ہے اور استکبار کی راہ سے مخالف ملّا اپنا فطری سرمایہ بھی کھو بیٹھتا ہے ۔ نعوذ باللہ منہ مگر ملّا سے میری مراد کٹھ ملّا ۔ اور بے بصیرت کٹھ حجت لوگ نہیں بلکہ وہ عارف و بالبصیرت ملّا ہے کہ جس کی نگاہوں میں حقائق الٰہیہ سمائی ہوئی ہوں ۔ اور اس لئے برق و بخار گیس و

دخان وغیرہ جیسی حقائق مادیہ اُسے لہو ولعب نظر آتی ہوں۔

اس سے میرا مقصد مسلمان کے حق میں سائنس اور فلسفہ کے میدان کو تنگ کرنایا قوت وشوکت کے مادی وسائل سے کلیتہً محروم بنانا نہیں بلکہ ان کی حدود بتلانا ہے کہ وہ وسائل محض ہیں مقاصد نہیں۔ وہ خود خلافت نہیں بلکہ تحفظ خلافت کے وسائل ہیں سے ادنیٰ درجہ کے وسائل ہیں۔ نیز یہ کہ وہ جو کچھ بھی ہوں قرآن کی آیات تکوین کا جن کو اس سلسلہ میں بطور ماخذ کے پیش کیا گیا ہے نہ مدلول ہیں نہ مصداق ہیں۔ اور نہ کوئی تقاضا کردہ عمل ہیں۔ ان کا ماخذ دوسری آیتیں ہیں جنہیں انکی نوعیت اور حدود پر کافی وافی روشنی ڈال دی گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کرنا ہے کہ یہ مادی سامان مسلمان کے لئے میدان ترقی ہی نہیں کہ ان میں گھس جانا اس کی مدح و ذم یا ایمانداری وغیر ایمانداری یا لفظی ومعنوی کفر و اسلام کا معیار قرار پا جائیں۔ مسلمان کے لئے معیار مدح و ذم صرف علم واخلاق تصرف روحانی اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔ مادی تصرفات بقدر ضرورت رکھے گئے ہیں فی نفسہٖ مقصود و معیار نہیں۔

اسی سے حریت و آقائی کا مفہوم بھی اسلامی حیثیت سے متعین ہو جاتا ہے کہ وہ تلوار ہاتھ میں لے لینا نہیں بلکہ قانون حق کو نافذ العمل بنانا ہے پہلے اپنے اوپر پھر ماحول اور اس کے پس وپیش پر۔ اگر کسی قوم نے تلوار ہاتھ میں لے کر قرآن کو اپنے اور اپنے ماحول پر نافذ کر لیا تو وہ بلا شبہ آقا ہے ورنہ قطعی طور پر غلام ہے خواہ نفس کی ہو یا غیر کی۔ پیغمبر معصوم اور صحابۂ کرام مکہ کی تیرہ سالہ

زندگی میں بھی آقا تھے جبکہ تلوار ہاتھ میں نہ تھی بلکہ اس کی اجازت بھی نہ تھی۔ اور مدینہ کی دس سالہ زندگی میں بھی ویسے ہی آقا تھے جبکہ وسائل شوکت اُن کے ہاتھ میں تھے۔ کتنے ہی انبیاء علیہم السلام کو جہاد وسیاست سرے سے دیئے ہی نہیں گئے۔ بعض کو دیئے گئے۔ لیکن دونوں کی آقائی اوسامر الٰہیہ کی تنفیذ میں خواہ وہ اخلاقی ہی رنگ میں ہو۔ اور عند اللہ مقبولیت وعظمت میں کسی کلام کی گنجائش نہیں۔ جس سے واضح ہے کہ آقائی کی حقیقت کوئی قدر مشترک ہے جو تلوار اور بے تلواری دونوں میں بدستور قائم رہتی ہے۔ اور وہ صرف دیانت انابت اور اشاعت ہے۔ اور جس کا حاصل اللہ کی غلامی ہے کہ اس میں آقائی کا راز پنہاں ہے۔

یہی دونوں حالتیں امت پر بھی گذرنی تھیں۔ امت کے بعض طبقے مکہ کی زندگی میں آگئے جس کا حاصل محض ہٹ لینا اور صبر کرنا نہیں بلکہ مار پی کھا کر اعلاء کلمۃ اللہ کرنا۔ اور ترویج کلام اللہ کو برابر انجام دیئے جانا ہے۔ جس کو قرآن نے جہاد کبیر فرمایا ہے۔ اور بعض مدینہ کی زندگی میں آگئے۔ جس کا حاصل قوت سے استیصال فتنہ کر کے اشاعت دین کی راہیں ہموار کرنا۔ اور شعائر اللہ کو اد بنانا ہے تاکہ دین حق ہمہ گیر اور غالب ہو جائے جس کو جہاد صغیر کہا گیا ہے۔ دونوں زندگیوں کا قدر مشترک وہی تدین بدین اللہ۔ اعلاء کلمۃ اللہ۔ تبلیغ کلام اللہ اور تربیت خلق اللہ نکلتا ہے جو اصل مقصود ہے۔ اور جو حقیقتاً ایمان

کے کمال ونقصان ہدایت وضلالت۔ فجور وتقوی اور خلافت وعدم خلافت کا معیار ہے جس کی رو سے مسلمانوں کو پرکھا جا سکتا ہے۔ پس اعدوا لهم ما استطعتم جیسی آیات کریمہ کے نام پہ تیر و تفنگ جمع کر لینا یا تکوین کی آیات سے بے محل استنباط کر کے صنعتی، تجارتی اور عسکری کاروبار پھیلا لینا فی نفسہ خواہ کتنا ہی ضروری ہو مگر خود حریت وآقائی نہیں۔ آقائی قرآن کو نافذ العمل بنا دینا ہے۔ جس کے لئے یہ اعدادِ مستطاع ایک وسیلہ اور ذریعہ سے زیادہ نہیں جیسے وضوء قرآن کی رُو سے فرض وواجب ہی مگر ہے بہرحال محض مفتاح صلوٰۃ بلکہ وہ ضروری بھی اسی کی وجہ سے ہے نہ فی نفسہ نہیں ہے۔

پس اگر ایک قوم نے شوکت حاصل کر لی۔ لیکن اس کی شوکت دین کے حدود و شعائر قائم کرنے سے غافل یا عاجز رہی تو اسے حریت وآقائی کے دعوے یا تصور کا کوئی حق نہیں۔ وہ بدستور غلام ہے۔ دوسروں کی ہو یا اپنے نفس کی۔ اور بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ۔ زیادہ سے زیادہ دوسرے غلاموں۔ اور اس میں یہ فرق ہوگا۔ کہ ایک بے تلوار کے غلام ہوں گے اور ایک با تلوار لیکن نفس غلامیِ نفس یا غیر میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ بلکہ تلوار سمیت غلامی زیادہ ننگ وعار ثابت ہوگی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم مسلمانوں کے تلوار بدست منطقوں کی بے حرمتی یا بے توقیری کے درپے ہیں۔ معاذ اللہ ہم ان کے ہر حالت میں دعا گو ہیں۔ لیکن یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ اگر ان کی یہ شوکت اعلاء کلمۃ اللہ سے ہمکنار

نہیں بلکہ اور اُلٹا اعلاء کلمۃ الکفر یا کلمۃ الفسق سے ہم آغوش ہے تو وہ ابھی تک
نہ صرف وسائل بے مقصد ہی کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں بلکہ خلاف
مقصد تگ و تاز کرنے سے ان کی یہ شوکت بھی کوئی اسلامی شوکت نہیں۔ اگر
ہے تو کسی حد تک محض قومی اور قوموں کے اشتراک کی وجہ سے خالص قومی
بھی نہیں۔ بلکہ وطنی۔ اور وہ بھی اگر غیر کی دست نگر ہے تو وطنی بھی نہیں بلکہ
ایک نمائشی شوکت ہے۔ پس اس قسم کے منطقے تا تحصیل مقصد آفاقی کے تصوّر
میں غلط رو اور دعوائے حریت میں غلط گو ہیں۔ جبکہ اسلام میں حریت و آفاقیؔ
تلوار کا نام نہیں تنفیذِ عدل قرآن کا نام ہے۔ جب وہ نہیں تو یہ وسائل اس
کے وسائل بھی نہیں۔ اور اس لئے ایسے منطقے نہ مقصود کے حامل ثابت ہوتے
ہیں نہ وسائل کے۔ بلکہ ان کی نسبت تو شاید وہی لوگ کچھ غنیمت ثابت
ہوں گے جو کم از کم اعلاء کلمۃ اللہ۔ ترویج کلام اللہ۔ اور تربیت خلق اللہ کے
مقصد کو علماً و عملاً سنبھالے ہوئے ہیں۔ اور بالفعل کے لئے جذبۂ صادق سے
قلوب کو خالی بھی نہیں پاتے۔ پس اگر مکہ کی صابرانہ زندگی تبلیغی جہاد کی وجہ سے
مجاہدانہ اور وہ بھی جہاد کبیر زندگی کہلائی جا سکتی ہے تو ایسے افراد کی زندگی اس
دورِ فتن میں کیوں اس پاک لقب کی مستحق نہیں ہو سکتی؟ ادھر جو لوگ تلوار بدست
ہو کر بھی اپنی عملی زندگی سے ان حقیقی مقاصد کی تکمیل کا ثبوت نہیں دیتے تو یہ
اسی کی دلیل ہو گی کہ ان کے مضمر نظریات صرف دنیوی اقتدار اور جاہ و عیش تک

محدود تھے۔ گو ان کا زبانی دعویٰ کچھ بھی تھا۔ نیز ثابت ہوگا کہ وہ با اقتدار تدین کو خلافت نہیں سمجھتے بلکہ صرف اقتدار ہی کو خلافت دا یمان سمجھے ہوئے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے اقتدار پر جس میں ملک اور دین توام نہ ہوں بلکہ ملک بلا دین ہو تو وہ یقیناً خلافت نہیں ملوکیت ہے اور جبکہ وہ ملوکیت بھی تحفظ دین و شعائر دین کا ذریعہ نہ بنے بلکہ اگر ذریعہ ہو تو منافیٔ دین امور کے تحفظ کا ہو تو وہ ملوکیت عادلہ کبھی نہیں بلکہ ملک عضوض ہے جسے کٹ کھنا ملک کہا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ شوکت افنار گناہ کے بجائے اضافۂ گناہ کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ اور اس صورت میں اس گناہ و فاحشہ کی نسبت انہی کی طرف کی جائے گی۔ جنھوں نے اضافۂ گناہ کے ان پر شوکت وسائل کو بنام اسباب افناء گناہ اختیار کر لیا ہے۔ کیونکہ جب انھوں نے ملزوم کو مان لیا ہے تو لوازم کا ماننا لامحالہ ان کے ہی سر پڑے گا۔ خواہ ان کا یہ ارادہ دنیت بھی نہ ہو۔ رہی حکومت و سلطنت تو اسباب معاش، صنائع و حرفت اور اسلحۂ جنگ کی طرح وہ بھی وسیلۂ قیام دین ہے خود بذاتہٖ مقصود نہیں اور اگر خلاف مقصود کا ذریعہ ہو سخت مضر ہے۔ سلطنت کو مقصود اصلی یاد کراتے اور محکوم مسلمانوں کو جو بدقسمتی سے کہیں دوسری اقوام کے غلام بن گئے ہوں غیر صالح یا غیر مؤمن یا لفظی مؤمن اور عملی کافر باور کرانے کے لئے عموماً یہ آیت پیش کی جاتی ہے۔

ان الارض یرثہا عبادی الصلحون — زمین کے مالک میرے نیک بندے ہونگے

جس کا حاصل یہ نکالا گیا ہے کہ صالح افراد جو اپنی محنت و ایثار، تسخیر کائنات، تنظیم، جد و جہد اور جفاکشی وغیرہ سے سلطنت کا استحقاق پیدا کرلیں زمین کے حکمران ہوں گے۔ لہٰذا جو حکمران ہیں وہ تو صالح ہیں خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں؟ اور جو نہیں ہیں وہ غیر صالح اور لفظاً مومن اور عملاً کافر ہیں۔

لیکن جبکہ یہ آیت اس بارہ میں خاص نہیں تو اس سے کہیں کے محکوم مسلمانوں کو ایمان کے بعد اسماء فسوق سے یاد کیا جانا انتہائی جسارت اور قرآن کی تحریف ہے۔ کیونکہ۔

(۱)۔ اول تو ان الارض کو ارض دنیا میں منحصر مان لینا ہی بے دلیل بلکہ خلاف دلیل ہے۔ سلف میں بکثرت اس سے ارض جنت مراد لے رہے ہیں۔ اور اسی کو اوفق بالقرآن کہہ رہے ہیں۔ چنانچہ سیاق و سباق کا تقاضا بھی یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں صلاح کو تحصیل سلطنت کی جد و جہد میں منحصر مان لینا غلط ہوگا۔ کیونکہ جنت میں امت مرحومہ اور امم سابقہ کے وہ لاتعداد انسان بھی جائیں گے جنہیں سلطنت نہیں ملی بلکہ ان کی شریعت ہی میں سلطنت نہیں رکھی گئی اور انہیں جہاد و سیاست کا سرے سے مکلف ہی نہیں بنایا گیا۔ اندریں صورت اس آیت سے محکوم مسلمانوں کو غیر صالح ٹھیرانا محض ایک جذباتی بات ہوگی۔

(۲) - اور اگر ارض سے ارض دنیا ہی مراد ہو اور وراثت ارضی سے حکومت و سلطنت تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں ساری زمین کی مراد لینا بھی بے دلیل ہوگا۔ جبکہ پورے روئے زمین پر مسلمانوں کی حکومت نہ آج ہے نہ قرن اولی سے آج تک ہوئی۔ ورنہ تیرہ صدی کے تمام مسلمان حتی کہ قرن اولی کے بھی۔ معاذ اللہ غیر صالح اور عملی کافر ٹھیریں گے۔ محکوم مسلمان بوجہ غلامی کے اور حکمران مسلمان بوجہ محدود السلطنت رہ جانے کے۔

(۳) - اور اگر وراثت ارض سے کل ارض کی نہیں بلکہ بعض ارض ہی کی حکومت مراد ہو تو جس صورت میں کہ یہ بعض غیر معین ہے اس حکومت کے تحقق کے لئے کیف ما اتفق کسی خطۂ زمین پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جانا کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں غیر آزاد خطوں کے محکوم مسلمان آیت بالا کی رو سے عملی کافر یا غیر صالح نہیں ٹھیرتے البتہ اگر روئے زمین کے کسی خطہ پر بھی مسلمانوں کی حکومت نہ ہو تو اس صورت میں معنیٰ مذکور کی رو سے سب گنہگار ٹھیریں گے۔

(۴) - اگر وراثت ارضی سے بعض معین خطوں کی حکومت مراد لی جائے جیسا کہ ملک شام اور فلسطین۔ چنانچہ بعض مفسرین سلف نے الارض کے الف لام کو لام عہد کہہ کر اس سے فلسطین ہی مراد لیا ہے تو پھر یہ آیت ایک مخصوص حکومت کی پیشین گوئی ٹھیرتی ہے جو دور صحابہ میں صالحین کے

ہاتھوں پوری ہوگئی۔ اب اس آیت کی رو سے کسی کو یہ حق کب پہنچتا ہے کہ وہ بعد کے مسلمانوں کو جو بدقسمتی سے کہیں محکوم بن گئے ہوں غیر صالح یا عملی کافر قرار دے۔ اس صورت میں اسلامی حکومت کی ضرورت کا ماخذ بھی یہ آیت نہ ہوگی۔ اگر ہوگی تو یہ آیت ہو سکے گی۔

ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ — زمین خدا کی ہے جسے چاہے اس کا وارث اپنے بندوں میں سے بنا دے۔

مگر اس میں وراثت کے ساتھ صالح کی قید نہیں۔ اس کی رو سے صالح اور غیر صالح دونوں حکمران بن سکتے ہیں۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ محکوم صالح بھی ہو سکتا ہے اور غیر صالح بھی۔ پھر محکوم کو غیر صالح اور عملی کافر کہہ دینا کس طرح جائز ہوگا؟

(۵) لیکن اگر اس آیت کو بلا تخصیص ساری ہی زمین کی حکومت پر محمول کر لیا جائے اور صرف وہی لوگ صالح کے لقب کے مستحق ہوں جو حکومت بنائیں، تب بھی اس وقت یا کسی وقت کے بھی محکوم مسلمان یا محکوم اسلامی خطے، غیر صالح یا عملی کافر قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ کیونکہ اس آیت میں اس ہفت اقلیم کی سلطنت کے لئے مسلمانوں کو کوئی میعاد نہیں دی گئی ہے کہ اس کے اندر اندر اگر وہ آل ورلڈ (عالمگیر) حکومت بنا لیں گے تو وہ صالح

رہیں گے ورنہ غیر صالح اور عملاً غیر مؤمن ٹھہر جائیں گے۔ ورنہ سب سے پہلے تو یہ عدم صلاح کا الزام معاذ اللہ قرن اولی ہی کے سر پڑ جائے گا۔ تا بقرون مابعد چہ رسد؟

ہاں اگر صلاح کا مطلب یہ ہو کہ قوم میں عالمگیر حکومت قائم کر لینے کا جذبہ اور ولولہ اور استطاعت کی حد تک سعی و عمل ہو تو پھر قرن اولی ہی نہیں سارے ہی قرون مابعد جو اس دور حکومت سے قبل قبل کے ہوں اس الزام سے بری ہو جائیں گے۔ کیونکہ ایسی حکومت جب بھی قائم ہو گی تو وہ درحقیقت اوّل سے آخر تک کی پوری امت کے جذبات اور مساعی ممکنہ کا نتیجہ ہو گی۔ اور اس کی تشکیل میں پوری ہی امت حصہ دار ہو گی۔ کیونکہ امت کے ایک ایک فرد کا ذہن اور عقیدہ اس میں لڑا ہوا تھا اور ہر پہلے کی ذہنیت پچھلے کے لئے بنیاد بنتی چلی آ رہی تھی۔ جونہی ابتدائی اور درمیانی افکار و اعمال کا لگاتار سلسلہ صدیوں کے بعد اپنی انتہائی حد پر آ پہنچا۔ اور اس مسلسل تبلیغ و عمل سے بالآخر دنیا کی تمام قومیں اس ذہنیت پر آ گئیں وہی آخری نتیجہ عالمگیر حکومت کی صورت میں نکل آیا۔ اس لئے محکومیت کے ان درمیانی قرون و ادوار میں امت کے کسی طبقہ کو بھی غیر صالح یا غیر مؤمن قرار نہیں دیا جائے گا۔ جبکہ ہر طبقہ اس حکومت بنانے میں اپنی اپنی بساط کی حد تک ذہناً و عملاً شریک رہا ورنہ

یہ آخری مطلوب نتیجہ اچانک برآمد کیسے ہوگیا۔ اگر افکار و مساعی کی ابتدائی اور درمیانی کڑیاں اسے برآمد گی کی حد پہ نہیں لا رہی تھیں؟

یہی وجہ ہے کہ ہر دور اور ہر زمانہ میں حتیٰ کہ آج بھی کسی حکومت کی تشکیل کو صرف زمانہ تشکیل ہی کے افراد کی طرف منسوب نہیں کر دیتے بلکہ آغاز تحریک سے لے کر اتمام تحریک تک کے تمام ہی افراد کی مساعی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اسی لئے اسٹیجوں پر تمام گذرے ہوئے لیڈروں اور بانیان تحریک کا نام زندہ رکھا جاتا ہے، پنڈالوں میں ان کے نام کے گیٹ بنائے جاتے ہیں۔ ان کے فوٹو اور مجسمے سجائے جاتے ہیں اور تقریر و تحریر میں عقیدت سے ان کے تذکرہ کو زندہ رکھا جاتا ہے بلکہ بعد کے لوگوں کو جن کے ہاتھ پر تحریک کی کامیابی ظاہر ہوتی ہے) اُن پہلے ہی لوگوں کی کاوشوں کا مظہر مانا جاتا ہے۔ پس اگر اس آیت میں وراثت ارض سے کل ارض مراد لے کر عالمگیر حکومت ہی مراد لی جائے جو یقیناً اب تک قائم نہیں ہوئی تو حسب تصریحات مفسرین امت سے لامحالہ وہی عالمگیر حکومت مراد ہو سکتی ہے جو ظہور مہدی اور نزول عیسوی کے وقت اس دنیا کے آخری دور میں وقت کے خیار اہل اللہ کے ہاتھوں تشکیل پائے گی۔ جس کے تحت پوری دنیا کا دین اور مسلک ایک ہو جائے گا ۔۔۔ اور لیظہرہ علی الدین کلہ کا کھلا ظہور ہو جائے گا۔ مگر جبکہ یہ حکومت

پوری امت کے ارتقائی جذبات و افکار کا ایک ظہور ہوگا۔ اور اس میں قرن اولیٰ سے لے کر قرن آخر تک کے تمام مسلمان اپنے اپنے جذبات و افکار اور ممکنہ اعمال سے شریک تھے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس حکومت عامہ سے پہلے پہلے کا کوئی طبقہ اور کوئی بھی محکوم علاقہ اس آیت کی رو سے غیر صالح اور عملی کافر ہوگا۔ ورنہ اس آخری طبقہ کے علاوہ جس کے ہاتھ پر اس عالمگیر تشکیل کا ظہور ہوا۔ سارے ہی طبقات امت معاذ اللہ غیر صالح اور غیر مؤمن ٹھیر جائیں گے۔ جس کا تصور بھی ہمارے نزدیک افجر فجور میں داخل ہے۔ یہاں تک کہ یہ آج کے مدعی بھی اپنی ہی زبان سے اپنی تکفیر سے نہ بچ سکیں گے۔

(۶)۔ پھر یہ کہ اگر آیت مذکورہ میں صالحین کا مفہوم استحقاق حکومت پیدا کرنے کی جدوجہد اور جانکاہی کے افعال میں گھس جانے ہی کا کہا جائے۔ اور اس کی رو سے وہی لوگ صالحین کا مصداق ہوں جو اس سعی کے حامل ہوں ورنہ وہ عملاً کافر اور لفظی مومن رہ جائیں تب بھی کلیتہً کوئی مسلمان طبقہ غیر صالح نہیں ٹھیر سکتا۔ کیونکہ اس تفسیر پر جہاں آیت نے تشکیل حکومت کی جدوجہد کو صلاح کہا ہے وہاں اس جدوجہد کی کسی خاص نوعیت کی تخصیص اور تعیین نہیں کی کہ وہ کیسی ہو؟ بلکہ مطلق چھوڑ دیا ہے جس کے اطلاق کے نیچے فوجی سعی بھی آتی ہے کہ تشدد سے انقلاب کر دیا

جائے، اقتصادی سعی بھی آتی ہے جیسے غاصب اقوام کا تجارتی بائیکاٹ کر کے اول اقتصادی اور پھر سیاسی آزادی حاصل کر لی جائے۔ صنعتی اور تمدنی سعی بھی آتی ہے جیسے شہری اور ملکی ضروریات کی خود کفالت کر کے غاصبوں کی اقتصادی گرفت سے نجات حاصل کر لی جائے۔ عدم تشدد اور مقاومت مجہول کی سعی بھی آتی ہے جس سے غاصب قوم کو معطل کر دیا جائے آئینی اور پارلیمنٹری سعی بھی آتی ہے جس کے تحت الیکشنوں کے ذریعہ حکومت بدل دی جائے وغیرہ وغیرہ۔ غرض صلاح کے معنیٰ اگر تحصیل حکومت کی سعی ہی کے رکھ لئے جائیں تو ان میں سے وہ کونسی سعی ہے جو اس آیت کے عموم سے باہر رہ جائے گی؟ اور جب کہ ان میں سے کسی نہ کسی سعی کو حسب اقتضائے مقام مسلمان اختیار کئے ہوئے ہیں اور کرتے چلے آ رہے ہیں تو وہ کونسا استدلال ہے جس کی رو سے وہ غیر صالح یا عملی کافر کہے جا سکتے ہوں؟ کیونکہ یا تو وہ برسر اقتدار ہیں یا ہوتے جا رہے ہیں یا ہونے کی سعی میں لگ رہے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی نوع بھی صالحین کے مفہوم سے باہر نہیں ہوتی۔ جبکہ صلاح کے معنیٰ اس سعی خاص ہی کے لے لئے جادیں تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ غیر صالح اور عملی کافر کس خطہ کے مسلمان ہیں جن کو مطعون کرنے کے لئے اس آیت کو بے محل استعمال کیا جاتا ہے۔

(۷)۔ لیکن اگر غور سے کام لیا جائے تو رعب زدگانِ تمدن وسیاست کے لئے

دین کے بر خلاف اپنے سیاسی منصوبے پورے کرنے اور اس میں حائل شدہ طبقات کو غیر صالح کہہ کر راستہ سے ہٹا دینے کی اس آیت میں کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ آیت میں وراثت یا حکومت ارضی کے حصول پر بحث نہیں بلکہ استحقاق پر گفتگو ہے۔ اور حاصل یہ ہے کہ ہر دور میں اللہ کے نیک بندے ہی اس وراثت کے مستحق ہوتے رہیں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ فساق و فجار اپنی چالاکیوں سے انہیں بر سر اقتدار نہ آنے دیں۔ اور ان کی مساعی کو اپنی عیارانہ مساعی سے ناکام بنا دیں۔

لیکن اس سے ان کے استحقاق میں فرق نہیں آسکتا جیسے نسبی وراثت کے سلسلہ میں اگر اصل وارث کو غاصب لوگ محروم کر دیں جس کی وراثت پر قرآن نے اسی طرح روشنی ڈالی ہے اور ہر ایک کا استحقاقی حصہ بتلا دیا ہے تو یہ نہیں کہ یہ وارث وارث نہ رہے اور یہ متغلب اور غاصب وارث بن جاوے۔

پس آیت کا حاصل یہ نکلا کہ حکومت ارضی کے وارث اور مستحق حقیقتاً صلحاء و اتقیا ہیں۔ اگرچہ کسی وجہ سے اس وراثت تک انہیں نہ آنے دیا جائے۔ نیز جبکہ ہر خبر میں کوئی نہ کوئی انشاء ضرور مخفی ہوتی ہے تو یہ اس خبر کا کہ "حقیقی وارثان اللہ از نیک بندے ہیں" حاصل یہ نکلے گا کہ اقتدار کی باگ ڈور صلحاء و اتقیاء کے ہاتھ میں رکھو تاکہ وہ صلاح و عدل کے

ساتھ حکومت چلائیں اور نیکی و تقویٰ کا دنیا میں دور دورہ ہو جائے۔ آیت کے یہ ایسے عام معنی ہیں کہ اس میں وہ تمام معانی داخل رہتے ہیں جو ابھی بیان کئے گئے ہیں ۔ اور کسی بھی دور کے کسی مسلم طبقہ کو خواہ مخواہ غیر صالح یا عملی کافر بنانے کا شوق بھی پورا نہیں ہو سکتا۔

رہا صالحین کا اقتدار سے محروم رہ جانا یہ کوئی عجوبہ نہیں دنیا میں ایسے اوقات بہت کم آئے ہیں کہ اقتدار کی کنجیاں حق پرستوں کے ہاتھ میں رہی ہوں عموماً دنیا پرست ان کے مقابلہ میں ایکا کر کے ہر جائز و ناجائز طریق پر اقتدار غصب کرتے آئے ہیں جس کی مثالیں امم سابقہ سے لے کر امت مرحومہ کے اکثر قرون و دہور میں بکثرت دستیاب ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس محروم الاقتداری کے باوجود شریعت نے انہیں صالحین ہی کہا ہے۔ غیر صالح یا غیر مومن نہیں بنایا۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتی ہیں۔

اذا ظهر المعاصی فی امتی	جب میری امت میں معاصی غالب
عمهم الله بعذاب من	ہو جاتے ہیں تو اللہ ان پر اپنا عام
عنده	عذاب نازل کرتا ہے۔
فقلت یا رسول الله اما	میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ان
فیهم اناس صالحون۔	میں نیک لوگ (صالحین) نہیں ہوتے؟
قال یصیبهم ما اصاب	فرمایا انہیں بھی وہ عذاب پہنچتا ہے

الناس ثم یصیرون الی مغفرۃ من اللہ و رضوان (تفسیر ابن کثیر ص ۲۹۹/۸)

جو عام لوگوں کو پہنچتا ہے۔ پھر آخرت میں مغفرت و رضا کی طرف جاتے ہیں (یعنی اپنی نیات پر ان کا حشر ہوگا) مگر یہاں عام و خاص میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔

اس عذاب عام کی تشخیص بھی بعض روایتوں میں فرمائی گئی ہے کہ وہ غلامی ہے

لیومرن علیکم شرارکم ثم یدعو خیارکم فلا یستجیب لکم (ابن کثیر ص ۲۹۹/۲)

تم پر تمہارے میں سے بدترین لوگ حاکم بنا دیئے جاتے ہیں۔ پھر تم میں سے اچھے لوگ دعائیں بھی مانگتے ہیں تو وہ قبول نہیں کی جاتیں۔

لیکن اس کے باوجود صالحین کو صالحین اور خیار کو خیار فرمایا گیا ہے جس سے واضح ہو گیا کہ غلامی کے باوجود صالحین کے صلاح میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اس کا یہ مقصد بھی نہیں کہ صالحین اپنی صلاح پر غرہ کرکے آزادی اور غلامی کا فرق اٹھا دیں، یا غلامی پر قناعت کرکے بیٹھ رہیں۔ یا صلاح کی علو باطن پر قناعت کرکے علو ظاہر سے کنارہ کش ہو جائیں اور انتم الاعلون کے ساعی اور طالب نہ رہیں۔ نہیں بلکہ صرف یہ غرض ہے کہ طعنہ زنوں کو ان صالحین کے محکوم ہو جانے کے باوجود بھی انہیں غیر صالح یا غیر مؤمن کہنے کا کوئی حق نہیں۔ اور اگر یہ جسارت آیت وراثتِ ارض سے کی جا رہی ہے تو وہ بے محل ہے اور کسی جائز تفسیر

پر مبنی نہیں۔ کیونکہ یہ استدلال دعوی عام اور دلیل خاص کا مصداق ہے۔
آیت کریمہ کے جبکہ اتنے محمل ہیں اور اس کے عموم میں اتنی وسعت ہے کہ نہ
ارض سے ارض دنیا ہی مراد لینا ضروری ہے، نہ ارض دنیا مراد لے کر وراثت سے
حکومت عالیہ ہی مراد لینا ضروری ہے، نہ حکومت عالیہ سے کل زمین کی حکومت
مراد لینا ہی ضروری ہے، نہ کل زمین کی حکومت مراد لے کر اسے کسی مقررہ وقت
میں حاصل کر لیا جانا ہی ضروری ہے تو ایسے محتمل اور کثیر المعنی استدلال سے اتنا
بڑا دعوی جس سے یک لخت کروڑوں اور وہ بھی ہر دور کے مسلمان غیر صالح اور
محض لفظی مومن اور عملی کافر قرار پا جائیں آخر کس طرح ثابت ہو جائے گا اور کیسے جائز
ہوگا۔ اور جبکہ آیت کا وہ جامع اور وسیع مفہوم لیا جائے جس کے نیچے یہ تمام معانی آ
جائیں یعنی استحقاق وراثت عام اس سے کہ حصول ہو یا نہ ہو تو پھر یہ تکفیر مسلمین کا
دعوے ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس سے بحالت محکومی صالحین کا صلاح زائل تو
کیا ہوتا یہ آیت اس صلاح کے ثبوت کی دلیل بن جاتی ہے۔

بہر حال صالحین کا سماوی طور پر گرفتار محکومی ہو جانا مصیبت ضرور ہے لیکن
معصیت نہیں کہ وہ تو بیک جنبش قلم غیر صالح بنا دیئے جائیں اور غاصبان اقتدار
فاسق معلن ہوتے ہوئے بھی صالح رہیں۔

الحاصل ان عرض کردہ سطور سے ان نظریات کی اصلیت کھل جاتی ہے
جنھیں "دو قرآن" کے انوکھے عنوان سے بطور ایجاد بندہ آیات تکوین کا مدلول

بتلا کر پیش کیا گیا ہے اور ان کی رُو سے مادی وسائل زندگی اور مادہ کی توڑ پھوڑ یا ترکیب و تحلیل سے کچھ اسباب عیش اور کچھ اسباب ہلاکت ایجاد کرتے رہنے اور بالفاظ دیگر ان سے تاجرانہ طریق پر منتفع ہوتے رہنے ہی کو مقصد حیات اور اسلام کی اصل ترقی باور کرایا گیا ہے اور پھر ان پر قابو پا لینے اور ان کے ذریعہ کچھ رسمی جاہ و اقتدار حاصل کر لینے ہی کا نام خلافت اور ایمانداری بتلایا گیا ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ

(۱) آیات تکوین کی رو سے صحیفۂ کائنات کا مطالعہ ضروری ہے۔ لیکن معرفت صانع کیلئے نہ کہ محض معرفت مصنوعات اور مادہ کی توڑ پھوڑ سے صنعتی کاروبار چلانے کے لئے۔

(۲) مادی اقتدار ضروری ہے لیکن قانون فطرت کو نافذ العمل بنانے اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے نہ کہ استبداد و تعیش اور اعلاء کلمۃ الفسق قائم رکھنے کے لئے۔

(۳) استخلاف فی الارض ضروری ہے۔ لیکن مادی حوائج سے غنی بن کر کامل بننے اور بنانے کے لئے نہ کہ وفور اسباب سے اپنی محتاجگی بڑھانے اور دنیا کی تعالی کرنے کیلئے

(۴) مدنیت اور تمدنی اکتشافات بقدر ضرورت ضروری ہیں لیکن تعاون باہمی پیدا کرنے کے لئے نہ کہ مادیت میں غلو اور فنافی العیش ہو جانے کے لئے۔

(۵) تسخیر کائنات ضروری ہے لیکن روحانی تصرفات کی مشق بہم پہنچانے اور صورتوں کے راستہ سے حقائق تک پہنچنے کے لئے نہ کہ مادی تصرفات میں محصور اور محدود رہ کر صورت پرستیوں اور مختلف الاشکال ڈیزائنوں میں غرق ہو جانے کے لئے۔

(۶) اعداء اللہ کی تخویف کے لئے امکانی تیاری (اعداد مستطاع) ضروری ہے لیکن دشمن کی تقابلی یا اس کے جیسا عَدَدُ اور عُدَدُ ضروری ہونے کے ساتھ نہیں بلکہ فی الجملہ اس کی رعایت رکھ کر قوت قلب، حوصلہ یقین، اور حکیمانہ تدابیر کی ضرورت کے ساتھ۔

(۷) اور بالآخر یہ تمام امور تمدن، سیاست، امارت، تسخیر، تکوین وغیرہ ضروری ہیں۔ مگر رضاء الٰہی اور قرب حق کے لئے نہ کہ رضاء نفس اور ارضاء غیر کے لئے۔

(۸) اور خلاصہ یہ ہے کہ جبکہ ان تمام دینی مقاصد کی تحصیل بغیر اتباع نبوی کے ناممکن ہے جو حقیقتاً عملی قرآن ہے تو بطور تفنن طبع اگر تعدد قرآن کا نظریہ موزوں ہے تو تین قرآن کے عنوان کے ساتھ تاکہ کتاب اللہ علمی قرآن ہو۔ کائنات اللہ برہانی اور تمثیلی قرآن ہو اور رسول اللہ کی ذات اقدس عملی قرآن ہو۔ نہ کہ دو قرآن کے نظریہ کے ساتھ جس میں سے تمثیلی قرآن تو سرے سے حذف ہو جائے اور عملی قرآن باقی بھی رہے تو تلبیس کے ساتھ اور غیر واقعی ہو کر یعنی بجائے ذات نبوی کے کائنات آجائے جس سے کوئی اسوہ اور عملی نمونہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال اس مضمون کی جملہ تفصیلات اور آخر میں اس نمبروار خلاصہ سے یہ مخفی نہیں رہتا کہ میرا مقصد مسلمانوں کی مادی صنعتی، عسکری اور دوسری انواع کی قوت و شوکت یا حسب ضرورت دنیا کے ترقی یافتہ وسائل کے استعمال سے گریز یا انکار کرنا نہیں بلکہ انہیں آیات تکوین کا مدلول کہے جانے، ان کے معیار کفر و اسلام ہونے اور

انہیں مقصدِ حیات کہہ کر اپنی ترقی کا میدان بنا لینے یا غلو و افراط اور مبالغوں سے ان میں منہمک اور فنا ہو جانے پر نکیر و انکار کرنا ہے۔ کیونکہ ان امور کی مقصودیت کا حاصل مادیت خالصتہً ہے اور مادیت کا طبعی ثمرہ افراطِ عیش اور اس مفرطِ عیش کا حاصل طغیان و سرکشی ہے جو نتیجتہً حق سے بغاوت ہے اور تیاری آخرت اور اعلاء کلمۃ اللہ میں حارج ہے جس کا دوسرا نام فساد فی الارض ہے اور ظاہر ہے کہ یہ خلافت نہیں بلکہ خلافت کی ضد ہے اور کون نہیں جانتا کہ اس ضدِ خلافت کو خلافت کہنا بلاشبہ تلبیس حق بالباطل اور کتمان حق ہے۔ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔

ان حقائق کے اصولی طور پر واضح ہو جانے کے بعد ضرورت نہیں رہتی کہ وہ قرآن کے ہر ہر جزئیہ کے بارے میں علیحدہ علیحدہ کچھ کہا جائے جبکہ اصل نظریہ کے بارے میں اصولی تنقید اور تحقیق سامنے آگئی جو ان جزئیات کی روح اور قدرِ مشترک ہے جس سے تمام جزئیات کا خود ہی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کا موضوع بھی جزئیات میں کلام کرنا نہ تھا بلکہ نظریات کی حد تک اصولی معروضات پیش کرنا تھا۔ جو ضرورت کی حد تک پیش کر دی گئیں۔ فان یک صوابا فمن اللہ وان یک خطأً فمنی ومن الشیطان ولاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم وباللہ التوفیق۔

ختم شد